www.aaiil.org

تحفظ ختم نبوت کا حقیقی علمبردار و احمدیہ انجمن اشاعت اسلام انڈیا کا ترجمان

ماہنامہ

چودھویں صدی

دہلی

سرپرست
جناب شوکت اے علی صاحب
دامت برکاتہم

۱۔ اداریہ...ایڈیٹر.................................۲

۲۔ درس قرآن
مولانا محمد علی لاہوری............۳

۳۔ حضرت مرزا غلام احمد مجدد صد چہاردہم کی سوانح عمری
ڈاکٹر بشارت احمد..................۵

۴۔ اللہ تعالیٰ سے تعلق کے لئے محویت کی ضرورت
حضرت مجدّد صد چہاردہم.........۹

۳۔ خدا کو پہچانیں
حکیم محمد مسیح الدین صدیقی...........۱۱

۴۔ کلمہ شہادت.....خزینۃ المعارف
عبدالرحمٰن مصری..........................۱۴

۵۔ اخوت و محبت معاشرے کا اہم ستون ہے
ادارہ..................................۲۲

۶۔ صحت عامہ
سید رشید الدین احمد...................۲۳

ایڈیٹر
مفتی ممتاز عالم

جلد نمبر..........۱۲
شمارہ.....................۴
جمادی الاوّل ۱۴۳۲ھ
بمطابق اپریل ۲۰۱۱ء

بدل اشتراک
فی شمارہ..........۱۰/روپے
سالانہ ۱۰۰/روپے
بیرون ملک ۱۰/پونڈ
ڈالر امریکن ۱۲ڈالر

خط و کتابت کا پتہ: احمدیہ انجمن اشاعت اسلام انڈیا L-25A، دلشاد گارڈن، دہلی 110095 فون 22596616-011 (موبائل) 9910750455
E-mail:ahmadiyyaanjuman@yahoo.co.in Our Websites: www.aaiil.org

قارئین حضرات !　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

افسوس! صد افسوس! مارچ ۲۰۱۱ء جاپان میں قیامت کا نمونہ، سمندری طوفان اور زلزلے ہزاروں انسان ایسے مرے کہ انہیں اس کا گمان بھی نہ تھا خوش وخرم ہنستے گاتے کھیلتے سوتے یکا یک موت نے انہیں آ جکڑا اور پھر خدا کی قدرت یاد آ گئی۔ یاد آ گیا کہ انسان کتنا بے بس اور قدرت کتنی جری ہے یہ ہولناک تباہی کا منظر تقریباً ہر جگہ دنیا کے سبھی لوگوں نے دیکھا۔ لائیو ٹیلی کاسٹ سے ٹیلی ویژن پر دکھائے گئے نظارے میں بے بس انسانوں کا جمِ غفیر جس طرح جائے امان کی تلاش میں بھاگ رہا تھا اور موت بشکل موج ان کے تعاقب میں تھی اسے دیکھ کر پتھر دل انسان بھی تڑپ گیا بچّے ٹی وی سے دور بھاگنے لگے انسانوں کی لاش لکڑی کے لٹھوں کی طرح یہاں وہاں بکھرے نظر آنے لگے، کار اور گاڑیاں کاغذ کی نَو کی طرح بہہ گئی اور دنیا بھر کا انسان اسے نہ روک سکا۔ زندہ انسانوں کی حالت زار مُردوں سے بدتر ہونے لگیں۔ فلک بوس عمارتوں کے ملبے اپنی کم مائیگی پر اشک شوئی کرنے لگے۔ سائنس وٹکنالوجی کی سیڑھیوں سے عرشِ خداوندی تک پہنچنے کی جسارت کرنے والے بے بس پھر رہے ہیں۔ موت! اور تباہی ہر جانب پھیرے لگاتی رہی اور ہم صرف اظہار تعزیت ہی کرتے رہے کیونکہ اس کے علاوہ ہم کچھ کر بھی نہیں سکتے۔

لیکن غور کرنے کی ضرورت ہے کہ کیا ایسی ایسی آفتیں جھیلنے کے بعد بھی انسانوں کی آنکھیں کھلتی ہیں؟ اور اگر کھلتی بھی ہیں تو کتنے دنوں تک کے لئے۔ رب ذوالجلال کا فرمان ہے ''جب ہم انسانوں پر اپنی نعمتوں کو نازل کرتے ہیں تو وہ مجھ سے مُکر جاتا ہے اور غافل ہوجاتا ہے اور جب اس کو تکلیف جکڑ لیتی ہے تو وہ جس حال میں بھی ہو ہم کو پکارتا ہے اور پھر جب اس کی تکلیف دور کردی جاتی ہے تو پہلی والی حالت پر آ جاتا ہے اور اللہ کو بھول بیٹھتا ہے۔''

جائے غور ہے کہ وقتی طور پر ہم آفاتِ سماوی سے دہل جاتے ہیں مسجدوں میں نمازیوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے مندروں اور گرجوں میں رونق ہوجاتی ہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہم یہ سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ اور اپنے خالق کی نافرمانی پر اتر آتے ہیں یا یوں کہئے کہ ہم اپنی بری خصلت کے سبب ایک مدت کے بعد پھر دوسرے اور تیسرے آفاتِ سماوی کا انتظار کرنے لگتے ہیں۔ الامان والحفیظ

لیکن انسان کو ہمیشہ یہ ضرور یاد رکھنا چاہئے کہ وہ کسی کا بندہ ہے اور اس کا کوئی خالق ہے۔ چنانچہ اس کے خالق کے اس پر حقوق ہیں۔ رب العالمین کا فرمان ہے ''ہم نے انسان کو عبادت اور بندگی کے لیے پیدا کیا ہے۔ لہٰذا انسان کو کبھی اپنی مقصد تخلیق نہیں بھولنی چاہئے اور ہمہ وقت اپنے خالق کا شکر گذار رہنا چاہئے۔ ہمارے خالق نے اس دنیا کو آزمائش اور امتحان گاہ بنایا ہے اور یہاں ایسے تمام حادثے اور واقعے اس خدا کی طرف سے ہی ہوتے ہیں جو فقط ہم انسان کا نہیں بلکہ پوری کائنات کا خالق ہے اور انسان لاکھ ترقی کرلے۔ مگر وہ اپنے خدا کا حقیر اور کمترین بندہ ہے اور اسے ہمیشہ یہ بھی یاد رکھنا ہوگا کہ خدا کی خدائی میں دخل اندازی کرنے کا انجا نہایت مہیب ہوتا ہے۔ اور سوائے اس کے انسان کو کوئی بچانے والا نہیں۔ سب اس کے سامنے بالکل بے بس اور مجبور ہیں۔ ہم اس کی اشرف المخلوقات ہونے کے باوجود اس قادر مطلق کے فیصلے میں کوئی دخل اندازی نہیں کرسکتے۔ ظاہر ہے وہ ہمارا خالق ہے اور ہم اس کی مخلوق۔ وہ اتنا رحیم وکریم بھی ہے کہ بلاغرض ہماری پرورش کرتا ہے اور وحی والہام سے ہماری بھرپور رہنمائی کرتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ہمارا خالق ہماری بہتری اور دونوں جہاں کی کامیابی کے لئے حضرت آدم صفی اللہ سے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ تک اپنے نبیوں کا ایک طویل سلسلہ قائم کیا ہے۔ یہ انبیاء ہمارے قلب ونفس کا تزکیہ اور ظاہری وباطنی اعمال کی اصلاح کا فریضہ انجام دیتے رہے ہیں اور خدا کی نافرمائی کے نتائج سے آگاہ، اور اس کے حکموں کی تعمیل پر، خدا کی دیدار اور جنت کی نعمتوں اور ابدی سعادت کی خوش خبری سنائی ہے۔

گذشتہ دنوں آئے سونامی کے قہر سے ہم انسان کو ضرور عبرت حاصل کرنی چاہئے۔ اور آئندہ اس کے سدباب کے لئے رب العالمین کے سامنے منت وسماجی کرتے رہنا چاہئے۔ اور مصائب میں مبتلاء لوگوں کی مدد کے لیے آگے آنا تو ہمارا اولین فریضہ ہونا ہی چاہئے۔ کیونکہ خدا کی مخلوق اگر کسی آفت کا شکار ہے تو اس کی مدد کے سِوا خدا کو راضی کرنے کا دوسرا کوئی طریقہ نہیں۔ وہاں موجود مہلوکین کے ورثاء آج جس غم واندوہ میں تڑپ رہے ہیں ہم ان کے دکھوں کو بکلی تو دور نہیں کرسکتے کیونکہ وہ ہنستے کھیلتے افراد جوان سے بچھڑ گئے ہیں۔ ہم ان کو واپس لانے کی قدرت نہیں رکھتے اور نہیں ہم ان یتیموں کے دلوں سے ان کے والدین کے نقش کو مٹا سکتے ہیں ہم بیواؤں کے سہا گکے اُجرنے اور ماؤں کے دلوں سے ان کے لخت جگر کے بچھڑنے کا غم بھی دور نہیں کرسکتے۔ لیکن ان کے غموں کو اپنی معاونت سے کچھ کم ضرور کرسکتے ہیں۔ بالآخر رب دوجہاں سے ہر دم ہماری یہی دعا ہے کہ وہ ہمارے اندر اس کی اہلیت وتوفیق بخشے، اور ہمیں ان آفات سے بچائے رکھے۔ اللہ ہمیں اسلام کے امن وآشتی کے پیغام کو زمین کے چپے چپے اور ہر مخلوق تک پہچانے کی توفیق بخشے اور پوری دنیا کو اسلام کی مقدس اور پاکیزہ تعلیمات سے روشناس فرمائے۔ ☆☆☆

درس قرآن

الذین یؤمنون بالغیب ویقیمون الصلوٰۃ ومما رزقنھم ینفقون کے معانی ومفاہیم

☆مفسر قرآن حضرت علامہ محمد علی لاہوریؒ کے قلم سے

الذین یؤمنون بالغیب ویقیمون الصلوٰۃ ومما رزقنھم ینفقونO

جوغیب پر ایمان لاتے ہیں، اور نماز قائم کرتے اور اس سے جو ہم نے ان کو دیا خرچ کرتے ہیں۔

یؤمنون: ایمان لانے کو کہتے ہیں اور یہ آمن سے ہے اور آمن کا استعمال دوطرح پر ہے متعدی جیسے آمنتہ جس کے معنی ہیں میں نے اس کے لیے امن کر دیا۔ اسی لحاظ سے اللہ تعالیٰ کا نام المومن ہے یعنی (اپنے بندوں کو) امن عطا کرنے والا۔ ایمان کا دوسرا مفہوم: اور اس کا دوسرا استعمال غیر متعدی ہے جب آمن کے معنی ہوں گے وہ امن والا ہوگیا۔ اصطلاح میں اس کا استعمال بعض وقت صرف اقرار لسانی پر بھی ہوتا ہے۔ یعنی زبان سے یہ اقرار کرنا کہ محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لایا۔ جیسے ان الذین اٰمنوا والذین ھادوا یا جیسے یایھا الذین اٰمنوا باللہ ورسولہ، اور بعض وقت اس سے مراد ہوتی ہے اپنے آپ کو تصدیق کے طور پر حق کا بکلی فرمانبردار کر دینا اور اس کے لیے تین باتوں کا جمع ہونا ضروری ہے، زبان سے اقرار کرنا، دل سے حق جاننا اور اس کے مطابق اعضاء سے کام کرنا، اور پھر اس کا اطلاق اعتقاد اور سچے قول اور عمل صالح ہر ایک پر بھی ہو جاتا ہے۔

ایمان کے معنی پر حدیث سے روشنی

احادیث نبوی سے بھی ایمان کے اس معنی پر شہادت ملتی ہے، بعض جگہ ایمان میں صرف اعتقاد کا ذکر کیا ہے اور بعض جگہ صرف اعمال صالح کا اور بعض جگہ دونوں کو ملا کر۔ اسی طرح کہیں فرمایا کہ حیا ایمان سے ہے، کہیں فرمایا ایمان کی ساٹھ سے اوپر شاخیں ہیں اسی طرح دوسرے اعمال کو ایمان میں داخل کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زبان سے اقرار ایمان کا بیج ہے لیکن اس کی نشوونما اس کی تکمیل بغیر اعمال صالحہ کے نہیں ہوتی۔

ایمان کا مفہوم خاص اسلام میں

ایمان کا وہ مفہوم اسلام میں نہیں جو دوسرے مذاہب میں ہے جیسے مثلاً عیسائی مذہب میں کفارہ پر ایمان ایک بات کے اقرار کر لینے کا نام ہے۔ جبکہ اسلام میں ایمان ایک معنی رکھتا ہے اور اس کے مطابق ایک عمل ہے۔ اللہ پر ایمان یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو اخلاق اللہ کے رنگ میں رنگین کرے۔ اس کی محبت اور معرفت کے حاصل کرنے کو زندگی کی اصل غرض سمجھے۔ فرشتوں پر ایمان ان کی نیک تحریکوں کو قبول کرنا ہے۔ رسولوں پر ایمان ان کے نقش قدم پر چلنا ہے۔ کتابوں پر ایمان ان کی باتوں پر عمل پیرا ہونا ہے۔ آخرت پر ایمان یہ ہے کہ ہر ایک فعل کا ایک لازمی نتیجہ ہے۔ اپنے کسی کام کو انسان لغو نہ سمجھے۔ علیٰ ہذا القیاس

ایمان بالغیب کی حقیقت

ابتداء میں بجائے اللہ پر ایمان کے الغیب کا لفظ کیوں اختیار فرمایا، ایک یہ بتانے کو کہ اس کی صفات پر آگہی انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ سے ہی ہوتی ہے۔ دوسرے تمام ترقیات کا مدار ایمان بالغیب پر ہے۔ ہر ایک علم میں کچھ باتیں مان کر انسان چلتا ہے۔ نتائج ان کی صحت کی تصدیق کر دیتے ہیں۔ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی معرفت پہلے دن حاصل نہیں کر سکتا کیونکہ وہ ذات نہاں در نہاں ہے۔ ہاں اسی الغیب پر ایمان لا کر جب انسان قدم آگے بڑھاتا ہے تو آخر کار وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کامل بھی حاصل کر لیتا ہے بلکہ اس سے ہمکلام بھی

ہوجاتا ہے گویا یوں کہنا چاہئے کہ غیب سے شروع کر کے قرآن مشاہدہ تک پہنچادیتا ہے۔

نماز کی تفصیلات

نماز کے متعلق قرآن شریف میں یہ تو فرمایا کہ نماز کتٰبــــاً مـوقـوتـا ہے یعنی اس کا اوقات مقررہ پر ادا ہونا ضروری ہے لیکن اس کی تفصیلات کہ کتنی دفعہ دن میں نماز ہو، کون کون سے وقت پر ہو، رکعات کی تعداد، ان کے ارکان اور ارکان کی ترتیب، اذکار کا ذکر قرآن شریف میں کسی ایک جگہ نہیں۔ اشـارۃ النص کےطور پر کوئی شخص کوئی نتیجہ نکال لے تو اور بات ہے۔

ارکان واوقات میں اتحاد اسلامی

دوسری طرف ان تمام تفصیلات میں عالم اسلامی میں حیرت انگیز اتحاد پایا جاتا ہے، سنی، شیعہ، خوارج، مقلد، غیر مقلد۔ پھر وہ فرقے جو ایک دوسرے کے ہمیشہ دشمن رہے۔ مشرق سے لے کر مغرب تک، اور ابتدا سے لے کر ابھی تک ایک ہی نماز پڑھتے چلے آئے ہیں۔ اور پڑھ رہے ہیں۔ چین یا افریقہ کا جنگل، جزائر بحر ہند ہوں یا روس کے دور دراز مقامات جہاں چلے جائیں، ایک ہی اوقات ایک ہی تعداد رکعات، ایک ہی ترتیب پائیں گے جس طرح اللہ ایک ، رسول ایک، قرآن ایک، قبلہ ایک ہے اسی طرح نماز بھی ایک ہے۔

آنحضرت ﷺ کی نماز

یہ اتفاق کبھی پیدا نہ ہوسکتا اگر یقیمون الصلوۃ کے سب سے پہلے عامل حضرت محمد ﷺ نے یہی نماز نہ پڑھی ہوتی۔ اور پھر آپ کو دیکھ کر صحابہ اور ان کو دیکھ کر تابعین نے علیٰ ہذا یہی نماز نہ پڑھی ہوتی۔ پس یہی وہ الصلوٰۃ ہے جس کی اقامت کا یہاں حکم ہے۔

ایمان بالغیب اور صلوٰۃ کا تعلق

یہ نماز اللہ کا قرب حاصل کرنے کا واحد ذریعہ ہے اس لیے ایمان بالغیب کے بعد فوراً اس کا ذکر کیا اور ایمان کے ساتھ عمل کا ذکر اصول میں داخل کر کے اس کی اہمیت بتادی۔ خدا پر ایمان ایک منہ کی بات رہتی، اگر اس کے ساتھ وہ ذریعہ نہ بتادیا ہوتا جس سے اس نہاں درنہاں ہستی سے انسان کا تعلق پیدا ہوسکتا ہے۔ صلوٰۃ چونکہ خدا کے آگے گرنے اور عاجزی کا نام ہے اس لیے جس قدر زیادہ انسان خدا کے حضور گرے گا اسی قدر زیادہ اخلاق الٰہی میں رنگین ہوگا اور ایمان کی اصل غرض پوری ہوگی۔ پس نماز دوسرا رکن ان پانچ ارکان میں سے ہے جو اسلام کی بنیاد قرار دئے گئے اور عملی ارکان میں سے یہ پہلا ہے۔

انفاق فی سبیل اللہ کا مفہوم

یہ تیسرا اصول ہے اور عملی زندگی میں جس کو اختیار کئے بغیر فلاح حاصل نہیں ہوسکتی اور ماحصل اس کا یہ ہے کہ اپنی تمام طاقتوں کو اور مال کو اور علم کو خدا کی راہ میں یعنی مخلوق کی بھلائی کے لیے لگادے۔ زکوٰۃ کی ادائیگی محض اس کا ایک حصہ ہے۔ نماز کے بعد اس کا ذکر ترتیب طبعی کے مطابق ہے ،اس لیے کہ مخلوق کی خیر خواہی صحیح رنگ میں وہی انسان کرسکتا ہے جس کا تعلق خالق سے پیدا ہو۔ اور خالق سے تعلق پیدا ہونے کا ذریعہ نماز ہے۔ پس جب نماز سے یہ مرتبہ حاصل ہوا کہ انسان خدا سے تعلق پیدا کر کے اخلاق الٰہی کے رنگ میں رنگین ہوا اور صفات الٰہی میں سب سے پہلی صفت ربوبیت ہے تو انسان کے لیے مخلوق کی خدمت ضروری ٹھہری، کیونکہ اگر بذریعہ نماز خدا سے تعلق پیدا کر کے مخلوق کی خدمت کا شوق پیدا نہیں ہوا، تو نماز کی اصل غرض ہی مفقود ہوگئی۔

صلوٰۃ اور زکوٰۃ کے اکٹھے ذکر میں حکمت

یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف میں ہمیشہ اقامت صلوٰۃ کے بعد زکوٰۃ کا یا خدمت مخلوق کا ذکر آتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جہاں نماز کی حقیقت سے بے خبری کا ذکر کیا وہاں بتادیا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو نماز صرف دکھاوے کی پڑھتے ہیں۔ کیونکہ مخلوق خدا کی خدمت کے چھوٹے چھوٹے کام بھی نہیں کرتے الذین ھم یرآء ون یمنعون الماعون۔ (۱۰۷،۶،۷)

حسن واحسان

عملی طور پر تکمیل نفس انسانی کے یہ دو ہی پہلو ہیں۔ خدا کے حضور جھکنا اور مخلوق خدا کی خدمت، ایک کو حسن کہتے ہیں اور دوسرے کو احسان۔ جب نماز کے ذریعہ سے حسن پیدا ہو تو ممـــا رزقـنهم میں احسان کی تعلیم دی۔

☆☆☆

حضرت مرزا غلام احمد مجدد صدی چہاردہم کی سوانح عمری

قسطوار

ڈاکٹر بشارت احمد

ایمان اور توکل کا امتحان:

الیس اللہ بکافٍ عبدہ کی قرآنی آیت بھی کس قدر جامع ہے۔ کیا اللہ اپنے بندہ کے لئے کافی نہیں ہے۔ اس میں ایک پہلو امتحان کا ہے اور دوسرا انعام کا۔ امتحان کا تو یوں کہ جب ایک بندہ کے لئے اللہ کافی ہے تو ماسوی اللہ کی اسے کیا پرواہ گئی۔ دنیا کی تمام مصیبتیں اس کے لئے ہیچ ہیں اور ہر ایک قسم کا نقصان اور دکھ اس کی نظر میں ہیچ ہے۔ اسے خدا جیسا خزانہ مل گیا ہے جس سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں۔ پس وہ بندہ جو خدا کو پانے کا مدعی ہے اگر تمام دنیا بھی اس سے چھین لی جائے تو اس کے صدق اور استقامت میں فرق نہیں آسکتا کیونکہ اس کے لئے اس کا خدا کافی ہے جو اس کا اصل مقصود او رمحبوب ہے۔ اور انعام کا پہلو یوں ہے کہ جب اللہ اپنے بندہ کے لئے کافی ہے تو پھر اس کی کل ضروریات کا وہ خود متکفل ہو جاتا ہے۔ زمین وآسمان اس کا ہو جاتا ہے۔ غیب سے اسے رزق ملتا ہے اور آسمان سے اس کے لئے سامان جمع ہوتے ہیں۔ اگر دنیا کا کوئی فرد بھی اس کی مدد نہ کرے تو بھی خدا اس کی مدد کے لئے کافی ہے۔ پس جب حضرت مرزا صاحب کو الہام ہوا کہ الیس اللہ بکاف عبدہ تو اس الہام کے دونوں پہلو کا ظہور ہوا۔ یعنی شروع میں امتحان کا اور بعد میں انعام کا۔ امتحان کا تو یوں کہ آپ کے والد صاحب کی وفات کے بعد مرزا غلام قادر صاحب آپ کے بڑے بھائی والد کے جانشیں قرار پائے۔ آپ کے والد صاحب کی جائداد کچھ مکانات اور دوکانیں اور زمین قادیان میں تھی۔ چونکہ آپ دو بھائی تھے اس لئے شرعاً وقانوناً وہ جائداد آپ دونوں کے حصہ میں آتی تھی۔ اور آپ کا حصہ آپ کے گزارہ کے لئے کافی تھا۔ لیکن آپ نے اپنے بڑے بھائی سے وہ جائداد تقسیم نہیں کرائی بلکہ اپنے والد صاحب کے زمانہ کی طرح اپنی جائداد سے کوئی سروکار نہیں رکھا۔ اور بڑے بھائی کو اپنے والد کا قائم مقام سمجھا۔ جو کچھ وہ دیدیتے اس پر گزارہ کر لیتے۔ مگر اس معاملہ میں انکا سلوک کچھ قابل تعریف نہ تھا کیونکہ ان کا مقصد فقط حصول دنیا تھا۔ وہ خود تو گورداسپور رہتے تھے کیونکہ وہاں ملازم تھے۔ ان کی غیر حاضری میں ان کے عیال اور منتظمین کے ہاتھوں آپ کو بہت تنگی اور تکلیف اٹھانی پڑتی تھی۔ حتیٰ کہ ضروریات زندگی کے حاصل کرنے میں بھی آپ کو بہت تکلیف ہوتی تھی۔ اور بعض دفعہ آپ کو فاقہ بھی کرنا پڑ جاتا۔ آپ کا یہ امتحان آپ کے بھائی کی وفات تک برابر جاری رہا۔ مگر آپ کے صبر اور توکل میں بال برابر بھی فرق نہ آیا۔ اور یہ آزمائش کے سال آپ نے بڑے صدق اور استقامت سے گزارے۔ باوجود اس کے کہ آپ کا اپنے والد مرحوم کی متروکہ جائداد میں برابر کا حصہ تھا۔ پھر بھی آپ نے اپنے بھائی میں دنیا کی رغبت دیکھ کر ان سے حصہ طلب نہ کیا اور محض کھانے کپڑے پر اکتفا کیا۔ گو آپ کے بھائی اپنی سمجھ کے مطابق آپ کی ضروریات کو پورا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اور آپ سے ایک حد تک محبت بھی رکھتے تھے۔ لیکن باوجود اس کے چونکہ وہ ایک سخت دنیادار آدمی تھے اور حضرت مرزا صاحب دنیا سے بالکل متنفر تھے۔ اس لئے وہ حضرت مرزا صاحب کو ضرورتِ زمانہ سے ناواقف اور سست اور نکما سمجھتے تھے۔ اور بعض دفعہ اظہار ناراضگی بھی کرتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ حضرت مرزا صاحب نے کسی اخبار کے منگوانے کے لئے

ان سے ایک نہایت قلیل رقم منگوائی تو انہوں نے باوجود اس کے کہ آپ کی جائداد پر قابض تھے انکار کر دیا اور کہا کہ ''یہ اسراف ہے کام کاج تو کچھ کرتے نہیں اور یونہی بیٹھے کتب واخبار کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں'' یہ خدائی امتحان آپ کے بھائی کی وفات تک جاری رہا۔ اس کے بعد انعام کا پہلو شروع ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ نے وہ مالی فتوحات عطا فرمائیں کہ لاکھوں روپے غیب سے آئے اور لاکھوں ہی خدا کی راہ میں خرچ ہوئے۔ آپ کی ضروریات کو اللہ تعالیٰ غیب سے پورا کرتا اور دین ودنیا کے سامان آپ کے لئے اپنی جناب سے جمع کرتا۔ اس کے بعد کبھی کسی چیز کی کمی نہ ہوئی۔ اور کیوں ہوتی۔ جو خدا کا ہوجاتا ہے خدا اس کا ہوجاتا ہے۔ **من کان لله فکان الله له** خود حضرت مرزا صاحب کیا خوب فرماتے ہیں:ـ

عاشقان روئے خود را ہر دو عالم میدہی
ہر دو عالم ہیچ پیشِ دیدۂ غلمان تو

الہامات کب سے شروع ہوئے:

آپ کی فطرت صحیحہ اور قلب سلیم اور آپ کے زہد اور عبادت اور تقویٰ اور اتباع قرآن وسنت نے اللہ تعالیٰ کے فضل کو جذب کیا اور جناب الٰہی نے اپنے قرب سے نوازا۔ اور اپنی پاک باتوں سے مشرف فرمایا۔ آپ کو رویائے صالحہ اور کشوف وغیرہ تو ابتدائی عمر سے شروع ہوگئے تھے مگر الہامات کے متعلق آپکی تحریروں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی قدر مکالمات الٰہیہ کا شرف آپ کو ۶۹۔۱۸۶۸ء سے حاصل ہوگیا تھا۔ جب آپ کو یہ الہام ہوا تھا کہ ''بادشاہ تیرے کپڑوں سے برکت ڈھونڈیں گے''، ممکن ہے اس سے پہلے بھی یہ شرف حاصل ہو۔ لیکن الہامات کا سلسلہ بڑے زور وشور سے آپ کے والد صاحب کی وفات سے شروع ہوا جو ۱۸۷۵ء میں ہوئی تھی۔

مکالمات الٰہیہ کا سلسلہ کیوں اسقدر زور شور سے ہوا:

مکالمات ومخاطبات الٰہیہ کا شرف اولیاء اللہ کو ہمیشہ حاصل ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ مگر جس قدر کثرت سے اس زمانہ میں حضرت مرزا صاحب کے ساتھ مکالمہ ہوا وہ اس امت کی تاریخ میں بے نظیر ہے۔ اور اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں خدا اور اس کے کلام کا جس شدت سے انکار ہوا ویسا دنیا کی تاریخ میں کبھی نہیں ہوا اس لئے ضروری تھا کہ اللہ تعالیٰ اس زمانہ میں جس مجدد کو ہدایت خلق کے لئے کھڑا کرتا اسے اپنے مکالمات سے بکثرت نوازتا تا مادہ پرستوں اور دہریوں پر اتمام حجت ہو۔ چنانچہ اسی لئے حضرت مرزا صاحب نے اپنی رویا اور کشوف اور الہامات کو دیگر بزرگوں کی طرح مخفی نہیں رکھا بلکہ اس کی بڑی زور شور سے اشاعت کی تا اس کے منکروں پر حجت تمام ہو۔ ایک طرف لامذہب خدا اور اس کے کلام سے منکر تھے تو دوسری طرف اہل مذاہب میں بھی برہمو سماج اور دیوسماج الہام الٰہی کے منکر تھے۔ آریہ سماج جس کا ہندوستان میں اس وقت بڑا زور تھا الہام کو گزشتہ زمانہ میں محدود کرکے اس کے دروازہ کو ہمیشہ کے لئے بند کر چھوڑا تھا۔ اور مسلمانوں میں نیچریوں کا ایک ایسا فرقہ پیدا ہوگیا تھا جو وحی الٰہی کے خارج سے نزول کا قائل نہ تھا بلکہ یہ ماننے لگا تھا کہ الہام قلب سے اٹھتا ہے اور قلب پر ہی پڑتا ہے۔ ایسی حالت میں وحی والہام کے مسئلہ کو صفائی سے اہل عالم پر ظاہر کرنے کے لئے ضروری تھا کہ اس زمانہ کے مجدد کو الہام الٰہی کے شرف سے پوری طرح صاحب حال بنا یا جاتا اور اس کے ذریعہ اس روحانی مسئلہ کی کیفیت کو ہر ایک طالب حق پر ایسا روشن کیا جاتا کہ کوئی دقیقہ شک وشبہ کا باقی نہ رہ جاتا۔

وحی ولایت:

حدیث شریف میں ایسے لوگوں کا نام محدَّث آیا ہے جو انبیاء تو نہیں ہوتے مگر اللہ تعالیٰ ان سے کلام کرتا ہے جیسا کہ حدیث صحیح میں ہے کہ **لقد کان فی من کان قبلکم رجال یکلمون من غیر ان یکونوا انبیاء فان یکن فی امتی احد فعمر** تم سے پہلے لوگوں میں ایسے لوگ ہوتے تھے کہ جن سے اللہ تعالیٰ ہم کلام ہوتا تھا گو وہ نبی نہ ہوتے تھے۔ میری امت میں اگر کوئی شخص ایسا ہے تو عمر ہے۔ قرآن کریم بھی مومنین مقربین کی نسبت فرماتا ہے۔ **لھم**

البشری فی الحیوة الدنیا (یونس:) کہ مومنوں کواس دنیا کی زندگی میں بشارتیں دی جاتی ہیں۔اور یہ بھی فرمایا: تتنزل علیھم الملئکة (حم السجدہ: ۳۰) کہ ان پر ملائکہ نازل ہوتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ کا مومنین مقربین سے کلام کرنا اور ملائکہ کا ان پر نزول قرآن وحدیث سے ثابت ہے۔ اور تمام اولیائے امت کم وبیش اسکے مدعی نظر آتے ہیں۔البتہ نزول جبرئیل بہ پیرایہ وحی رسالت چونکہ وحی نبوت سے مختص ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ پر نبوت ختم ہوچکی اس لئے اب جو وحی والہام محدثین اور اولیائے امت سے ہوتا ہے وہ خواہ دیگر ملائکہ کی وساطت سے ہو مگر جبرئیل کی وساطت سے نہیں ہوتا اور ان الہامات کو وحی ولایت کہا جاتا ہے نہ کہ وحی نبوت۔

قرآن وسنت کی اتباع کے ثمرات کا ثبوت:

اللہ تعالیٰ سے مکالمہ ومخاطبہ جو مومنین ومقربین کو حاصل ہوتا ہے وہ دراصل قرآن اور سنت کی اتباع کے ثمرات ہوتے ہیں۔ یعنی قرآن کریم کی اطاعت اور محمد رسول اللہ ﷺ کی اتباع سے انسان اس مقام قریب الٰہی تک پہنچ جاتا ہے کہ انسان کو مکالمات الٰہیہ کا شرف حاصل ہوجاتا ہے۔ اور یہ اسلام کے زندہ مذہب ہونے کا نشان ہے کہ ہر زمانہ میں اور آج بھی قرآن وسنت کی پیروی سے ایسے کامل لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں جن کی دعائیں اللہ تعالیٰ سنتا اور اپنے مکالمات ومخاطبات سے انہیں مشرف فرماتا ہے۔اسلام کے سوا باقی تمام مذاہب کی پیروی سے اب یہ ثمرات حاصل نہیں ہوتے۔ اس لئے کہ وہ مذاہب خواہ ابتدا میں منجانب اللہ ہی ہوں مگر اسلام کے آنے کے بعد چونکہ انکی ضرورت نہ رہی اس لئے وہ مذاہب مردہ ہوگئے اور ان کے ثمرات پیچھے رہ گئے۔ گویا ان میں جو کچھ تھا وہ زمانہ ماضی میں گزر چکا اور اب کچھ نہیں۔ کیونکہ وہ اب زندہ مذہب نہیں رہے۔ مگر اسلام چونکہ ایک زندہ مذہب ہے اس لئے اس کے ثمرات آج بھی توتی اکلھا کل حین کے مطابق اسی طرح ملتے ہیں جس طرح پہلے ملتے تھے۔ حضرت مرزا غلام احمد صاحب کا دعویٰ بھی انہی کاملین امت میں سے ایک ہونے کا تھا جو سلوک کے تمام مدارج کو طے کرکے جناب الٰہی کے مقربین میں شامل ہوکر مکالمات ومخاطبات الٰہیہ سے مشرف ہوا کرتے ہیں۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے چونکہ اس نعمت سے حصہ وافر دیا تھا اس لئے اس پہلو کو خاص طور پر آپ نے اس مادیت کے زمانہ میں جب وحی اور الہام سے عام طور پر انکار ہورہا تھا بڑے زور اور تحدی سے اہل عالم کے سامنے پیش کیا اور اسلام کی صداقت اور اس کے تمام دنیا میں واحد زندہ مذہب ہونے کے ثبوت میں اپنے حالی تجربات کو پیش کیا اور بتایا کہ میں نے اسلام کو خود تجربہ کرکے اسے سچا اور زندہ مذہب پایا کیونکہ اس کے ذریعہ میں نے زندہ خدا کو پایا اور اس کے مکالمہ ومخاطبہ سے مشرف ہوا اور اسلام کے باہر کسی مذہب میں زندگی اور قوت روحانی باقی نہیں۔ اگر کوئی اس کا مدعی ہے تو وہ میرے سامنے آئے۔ چنانچہ ایک نظم میں بھی اسی بات کو کس خوبصورتی سے پیش کرتے ہیں: ؎

ہر طرف فکر کو دوڑا کے تھکایا ہم نے
کوئی دیں دینِ محمدؐ سا نہ پایا ہم نے
کوئی مذہب نہیں ایسا کہ نشاں دکھلاوے
یہ ثمر باغِ محمدؐ سے ہی کھایا ہم نے
ہم نے اسلام کو خود تجربہ کرکے دیکھا
نور ہے نور اٹھو دیکھو سنایا ہم نے
اور دینوں کو جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا
کوئی دکھلائے اگر حق کو چھپایا ہم نے
آؤ لوگو کہ یہیں نورِ خدا پاؤ گے
لو تمہیں طور تسلی کا بتایا ہم نے

منکرین الہام پر اتمام حجت:

الغرض آپ نے ایک طرف تو دہریوں اور لا مذہبوں پر اللہ تعالیٰ کی ہستی کے بارے میں صدہا دلائل عقلیہ دیتے ہوئے یوں حجت تمام کی کہ مشاہدہ اور تجربہ سے بڑھ کر اور کوئی دلیل نہیں ہوسکتی۔اور اسلام ہی وہ زندہ مذہب ہے کہ اس پر عمل کرنے سے وہ حیّ و قیوم خدا انسان کو ملتا اور اس سے بولتا ہے۔اور میں اس میں صاحب تجربہ ومشاہدہ ہوں۔جس کا دل چاہے میرے پاس آکر امتحان کرلے۔اور دوسری طرف اہل مذاہب پر یوں حجت تمام کی کہ اگر مذہب کا مقصد یہ ہے کہ بندہ کو خدا سے ملاوے تو پھر اسلام کے سوا اب کوئی سچا اور زندہ مذہب نہیں۔جسکے ذریعہ بندہ خدا کو پاتا اور اس کے مکالمہ ومخاطبہ سے مشرف ہوتا ہے اور میں اس میں صاحب تجربہ اور صاحب حال ہوں جس کا دل چاہے میرے مقابلہ پر آجائے۔

اسلام کی صداقت پر بعض نشانات جنہیں آپ غیر مسلموں کے سامنے پیش کرتے رہے:

غیر مسلموں اور منکرین الہام ووحی پر حجت تمام کرنے کے لئے ابتدا سے آپ کا یہ طریق تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب کوئی خبر ملتی خواہ بذریعہ الہام ہو یا بذریعہ کشف تو آپ قادیان کے ان تمام آریوں وغیرہ کو جن سے اسلام کی صداقت پر دن رات گفتگو ومباحثہ ہوتے رہتے تھے سنا دیتے تا ان پر حجت تمام ہو۔ لالہ ملاوامل اور شرمپت رائے قادیان کے دو آریہ آپ کے اکثر ملنے والوں میں سے تھے۔آپ کے والد صاحب کی وفات کے بعد جب سلسلہ مکالمات ومخاطبات الٰہیہ نہایت زور سے شروع ہوا تو جو نئی خبر ملتی تو ان دو آریوں کو بالخصوص اور بہت سے آدمیوں کو بالعموم سنا دیتے تا اسلام کی صداقت پر وہ گواہ ٹھہر جائیں۔چنانچہ بعد میں حضرت مرزا صاحب نے ان نشانات کو اپنی کتابوں میں درج کر کے لالہ ملاوامل اور شرمپت رائے کو چیلنج دیا کہ وہ اپنے بیٹوں کے سر پر ہاتھ رکھ کر اور ان کی قسم کھا کر ان نشانوں کا انکار کر جائیں لیکن ان دونوں کو کبھی جرأت نہیں ہوئی کہ انکار کریں۔میں ان میں سے دو تین نشانات بطور نمونہ درج کرتا ہوں۔

نشان نمبر ا

الالہ ملاوامل پر اتمام حجت:

لالہ ملاوامل جب بیس یا بائیس برس کی عمر کے تھے تپ دق میں مبتلا ہوگئے۔حضرت مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ:

''رفتہ رفتہ اس کی مرض انتہا کو پہنچ گئی اور آثار مایوسی کے ظاہر ہوگئے۔ایک دن وہ میرے پاس آکر اور اپنی زندگی سے ناامید ہوکر بہت بیقراری سے رویا۔میرا دل اس کی عاجزانہ حالت پر پگھل گیا۔اور میں نے حضرت احدیت میں اس کے لئے دعا کی۔ چونکہ حضرت احدیت میں اس کی صحت مقدر تھی اس لئے دعا کرنے کے ساتھ ہی یہ الہام ہوا۔**قلنا یا نار کونی برداً وسلاماً** یعنی ہم نے تپ کی آگ کو کہا کہ تو سرد اور سلامتی والی ہو جا۔چنانچہ اسی وقت اس ہندو اور نیز کئی اور ہندوؤں کو جواب تک اس قصبہ میں موجود ہیں اور اس جگہ کے باشندے ہیں اس الہام سے اطلاع دی گئی۔اور خدا کامل بھروسہ کر کے دعویٰ کیا گیا کہ وہ ہندو ضرور صحت پائے گا۔اور اس بیماری سے ہرگز نہیں مرے گا۔چنانچہ اس الہام کے بعد ایک ہفتہ کے اندر ہی اندر وہ شفا پا گیا'' (براہین احمدیہ صفحہ ۲۲۷-۲۲۸)

☆☆☆

اللہ تعالیٰ سے تعلق کے لیے محویت کی ضرورت

حضرت مجدد صدچہاردھم ؒ

خداتعالیٰ ایک تعلق چاہتا ہے اور اس کے حضور میں دعا کرنے کے لیے تعلق کی ضرورت ہے۔بغیر تعلق کے دعا نہیں ہوسکتی۔پہلے بزرگوں کی بھی اس قسم کی باتیں چلی آئی ہیں کہ جن سے دعا کرنے والوں کو دعا کرانے سے پہلے تعلق ثابت کرنے کی تاکید کی۔خواہ نخواہ بازار میں چلتے ہوئے کسی بے تعلق کو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ تو میرا دوست ہے اور نہ ہی اس کے لئے درددل پیدا ہوتا ہے۔اور نہ ہی جوش پیدا ہوسکتا ہے۔اللہ تعالیٰ سے تعلق اس طرح نہیں ہوسکتا کہ انسان غفلت کاریوں میں مبتلا بھی رہے اور صرف منہ سے دم بھرتا رہے کہ میں نے خداتعالیٰ سے تعلق پیدا کرلیا ہے۔اکیلے بیعت کا اقرار اور سلسلہ میں نام لکھ لینا ہی خداتعالیٰ سے تعلق پر کوئی دلیل نہیں ہوسکتی۔اللہ تعالیٰ سے تعلق کے لیے ایک محویت کی ضرورت ہے۔ہم بار بار اپنی جماعت کو اس بات پر قائم ہونے کے لیے کہتے ہیں۔کیونکہ جب تک دنیا کی طرف سے انقطاع اور اس کی محبت دلوں سے ٹھنڈی ہو کر اللہ تعالیٰ کے لیے فطرتوں میں طبعی جوش اور محویت پیدا نہیں ہوتی اس وقت تک ثبات میسر نہیں آسکتا۔

بعض صوفیوں نے لکھا ہے کہ صحابہؓ جب نمازیں پڑھا کرتے تھے تو انہیں ایسی محویت ہوتی تھی کہ جب فارغ ہوتے تو ایک دوسرے کو پہچان بھی نہ سکتے تھے۔جب انسان کسی اور جگہ سے آتا ہے تو شریعت کا حکم ہے وہ آکر ''السلام علیکم'' کہے۔نماز سے فارغ ہونے پر السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہنے کی حقیقت یہی ہے کہ جب ایک شخص نے نماز کا عقد باندھا اور اللہ اکبر کہا تو وہ گویا اس عالم سے نکل گیا اور ایک نئے جہاں میں جا داخل ہوا۔گویا ایک مقام محویت میں جا پہنچا۔پھر جب وہاں سے واپس آیا تو ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ'' کہہ کر آن ملا۔لیکن صرف ظاہری صورت کافی نہیں ہوسکتی جب تک دل میں اس کا اثر نہ ہو،چھلکوں سے کیا ہاتھ آسکتا ہے۔محض صورت کا ہونا کافی نہیں،حال ہونا چاہئے۔علت غائی حال ہی سے پیدا کرلیتا ہے اور اپنے حقیقی خالق ومالک سے ایسی سچی محبت اور اخلاص پیدا کرلیتا ہے کہ بے اختیار اس کی طرف پرواز کرنے لگتا ہے اور ایک حقیقی محویت کا عالم اس پر طاری ہوجاتا ہے،تو اس وقت اس کیفیت سے انسان گویا سلطان بن جاتا ہے اور ذرہ ذرہ اس کا خادم بن جاتا ہے۔

مجھے تو اللہ تعالیٰ نے ایسی محویت دی تھی کہ تمام دنیا سے الگ ہو بیٹھا تھا۔تمام چیزیں سوائے اس کے مجھے ہرگز بھاتی نہ تھیں ،میں ہرگز ہرگز حجرہ سے باہر قدم رکھنا نہیں چاہتا تھا۔میں نے ایک لمحہ کے لیے بھی شہرت کو پسند نہیں کیا،میں بالکل تنہائی میں تھا اور تنہائی ہی مجھ کو بھاتی تھی،شہرت اور جماعت کو جس نفرت سے میں دیکھتا تھا اس کو خدا ہی جانتا ہے ،میں تو طبعاً گمنامی کو چاہتا تھا اور یہی میری آرزو تھی۔خداتعالیٰ نے مجھ پر جبر کرکے اس سے مجھے باہر نکالا۔میری ہرگز مرضی نہ تھی مگر اس نے میری خلاف مرضی کیا کیونکہ وہ ایک کام لینا چاہتا تھا۔اسی کام کے لیے اس نے مجھے پسند کیا اور اپنے فضل سے مجھ کو اس عہدہ جلیلہ پر مامور فرمایا۔یہ اسی کا اپنا انتخاب اور کام ہے ،میرا اس میں کچھ دخل نہیں۔میں تو دیکھتا ہوں کہ میری طبیعت اس طرح واقع ہوئی ہے کہ شہرت اور جماعت سے کوسوں بھاگتی ہے اور مجھے سمجھ نہیں آتا کہ لوگ کس طرح شہرت کی آرزو رکھتے ہیں میری طبیعت اور طرف جاتی تھی لیکن خداتعالیٰ مجھے اور طرف لے جاتا تھا۔میں نے بار بار دعائیں کیں کہ مجھے گوشہ میں ہی رہنے دیا جائے مجھے میری خلوت کے حجرے میں ہی چھوڑ دیا جائے۔لیکن بار بار حکم ہوا کہ اس سے نکلو اور دین کا کام جو اس وقت سخت مصیبت کی حالت میں تھا،اس کو سنوارو۔انبیاء کی طبیعت اسی طرح واقع ہوتی ہے کہ وہ شہرت کی خواہش نہیں کیا کرتے ،کسی نبی نے کبھی شہرت کی خواہش نہیں کی۔ہمارے نبی کریم ﷺ بھی خلوت اور تنہائی کو ہی پسند کرتے تھے۔آپ عبادت کرنے کے لیے لوگوں سے دور تنہائی کی غار میں جو غار حرا تھی چلے جاتے تھے۔یہ غار اس قدر خوفناک تھی کہ کوئی انسان اس میں جانے کی جرأت نہ کرسکتا تھا۔لیکن آپ نے اس کو اپنے لیے پسند کیا ہوا تھا کہ وہاں کوئی ڈر کے مارے بھی نہ پہنچے گا۔آپ بالکل تنہائی چاہتے تھے۔شہرت کو ہرگز پسند نہیں کرتے تھے۔مگر خداتعالیٰ کا حکم ہوا ''یاایھا المدثر قم فانذر'' (المدثر ۲:۳،۲)

اس حکم میں ایک جبر معلوم ہوتا ہے اور اسی لیے جبر سے حکم دیا گیا کہ آپ تنہائی کو جو آپ کو بہت پسند تھی اب چھوڑ دیں۔ بعض لوگ بیوقوفی اور حماقت سے یہی خیال کرتے ہیں کہ گویا میں شہرت یافتہ ہوں، میں بار بار کہہ چکا ہوں کہ میں ہرگز شہرت پسند نہیں۔ خدا تعالیٰ جبر سے مجھ کو مامور کیا ہے، میرا اس میں کیا قصور ہے اور وہی گواہ ہے کہ میں شہرت پسند نہیں ہوں، میں تو دنیا سے ہزاروں کوس بھاگتا تھا۔ حاسدوں کی نظر چونکہ زمین اور اس کی اشیاء تک ہی محدود ہوتی ہے اور وہ دنیا کے کیڑے ہیں اور شہرت پسند ہوتے ہیں، ان کو اس خلوت گزینی اور بے تعلقی کی کیفیت ہی معلوم نہیں ہوسکتی، ہم تو دنیا کو نہیں چاہتے، اگر وہ چاہیں اور اس پر قدرت رکھتے ہیں تو سب دنیا لے جائیں ہمیں ان پر کوئی گلہ نہیں، ہمارا ایمان تو ہمارے دل میں ہے نہ دنیا کے ساتھ۔ ہماری خلوت کی ایک ساعت ایسی قیمتی ہے کہ ساری دنیا اس ایک ساعت پر قربان کرنا چاہیئے۔ اس طبیعت اور کیفیت کو سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا مگر ہم نے خدا تعالیٰ کے امر پر جان و مال و آبرو کو قربان کر دیا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کسی کے دل میں تجلّی کرتا ہے تو پھر وہ پوشیدہ نہیں رہتا، عاشق اپنے معشوق کو خواہ کیسے ہی پوشیدہ کرے، مگر بھید پانے والے اور تاڑنے والے قرائن اور آثار و حالات سے پہچان ہی جاتے ہیں۔ عاشق پر وحشت کی حالت نازل ہوجاتی ہے اداسی اس کے سارے وجود پر چھا جاتی ہے۔ الگ قسم کے خیالات اس کے ظاہر ہوجاتے ہیں۔ وہ اگر ہزاروں پردوں میں چھپے اور اپنے آپ کو چھپالے مگر چھپا نہیں رہتا۔ سچ کہا ہے۔

عشق و مشک را نتواں نہفتن

جن لوگوں کو محبت الٰہی ہوتی ہے وہ اس محبت کو چھپاتے ہیں جس سے ان کے دل لبریز ہوتے ہیں۔ بلکہ اس کے افشاء پر وہ شرمندہ ہوتے ہیں کیونکہ محبت اور عشق ایک راز ہے جو خدا اور اس کے بندے کے درمیان ہوتا ہے اور ہمیشہ راز کا فاش ہونا شرمندگی کا موجب ہوتا ہے۔ کوئی رسول نہیں آیا، جس کا راز خدا تعالیٰ سے نہیں ہوتا۔ اسی راز کو چھپانے کی خواہش اس کے اندر ہوتی ہے، مگر معشوق خود اس کو فاش کرنے پر جبر کرتا ہے اور جس بات کو وہ نہیں چاہتے وہی ان کو ملتی ہے جو چاہتے ہیں ان کو نہیں ملتا اور جو نہیں چاہتے وہی ان کو جبراً ملتا ہے۔

جب تک انسان ادنیٰ حالت میں ہوتا ہے اس کے خیالات بھی ادنیٰ ہی ہوتے ہیں اور معرفت سے حسن ظن پیدا ہوتا ہے۔ ہر شخص میں محبت اپنے ظن کی نسبت سے ہوتی ہے۔ انا عند ظن عبدی بی سے یہی تعلیم ملتی ہے۔ صادق عاشق جو ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ پر حسن ظن رکھتا ہے کہ وہ اس کو کبھی نہیں چھوڑے گا۔ خدا تعالیٰ تو وفاداری کرنا پسند کرتا ہے بلکہ وہ چاہتا ہے کہ انسان صدق دکھلائے اور اس پر ظن نیک رکھے کہ تا وہ بھی وفا دکھلائے مگر یہ لوگ کب اس حقیقت کو سمجھ سکتے ہیں یہ تو اپنی ہوا و ہوس کے بتوں کے آگے جھکے رہتے ہیں اور ان کی نظر دنیا تک ہی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو کریم و رحیم نہیں سمجھتے۔ اس کے وعدوں پر ذرہ ایمان نہیں رکھتے اگر اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر ایمان رکھتے کہ وہ کریم و رحیم ہے تو وہ بھی ان پر رحمت اور وفا کے ثبوت نازل کرتا۔

گر وزیر از خدا بترسیدے
ہمچناں کز ملک ملک بودے

اللہ تعالیٰ سے بدظنی مت کرو

شر بدظنی سے پیدا ہوتا ہے قرآن شریف کو اول سے آخر تک پڑھنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے بدظنی مت کرو۔ اللہ تعالیٰ کا ساتھ نہ چھوڑو۔ اسی سے مدد مانگو۔ اللہ تعالیٰ ہر میدان میں مومن کی مدد کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں میدان میں تیرے ساتھ ہوں وہ اس کے لئے ایک فرقان پیدا کر دیتا ہے جو اس کے وعدوں پر بھروسہ نہیں کرتا وہ بدظنی کرتا ہے، جو شخص خدا تعالیٰ سے نیک ظن کرتا ہے وہ اس کی طرف رجوع کرتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ سے بدظنی کرتا ہے، وہ مجبور ہوتا ہے کہ اپنے لیے کوئی دوسرا معبود بنائے اور شرک میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ جب انسان اس بات کو سمجھتا ہے کہ خدا کریم و رحیم ہے اور اس بات پر ایمان صدق دل سے لاتا ہے کہ اس کے وعدے ٹلنے کے نہیں تو وہ اس پر جان فدا کرتا ہے اور در پردہ خدا تعالیٰ سے عشق رکھتا ہے۔ ایسا انسان خدا تعالیٰ کا چہرہ اسی دنیا میں دیکھ لیتا ہے۔ خدا تعالیٰ طرح طرح سے اس کی مدد کرتا ہے اور اپنے انعامات اس پر نازل کرتا ہے اور اس کو تسلی بخشتا ہے اور محبت اور وفا کا چہرہ دکھاتا ہے، لیکن بے وفا غدار ہمیشہ محروم رہتا ہے۔

(ملفوظات چہارم، ص۳۲ تا ۳۶)

☆☆☆

خدا کو پہچانیں

ازقلم: حکیم محمد مسیح الدین صدیقی

اس کائنات میں ایک عظیم الشان قوت وانرجی کارفرما ہے، جو نہ صرف ہر شئے کے وجود اور بقا کا اصل سبب ہے بلکہ اس کی پرورش ونگہداشت بھی کر رہی ہے۔ جو ہر شئے کی موجد بھی ہے اور ہر شئے میں موجود بھی۔ جو پوری کائنات اور اس کی ہر شئے پر محیط ہے۔ ہر جگہ اسی کے قانون کارفرما ہے ہیں اور ہر شئے اسی کے قانون کی تابع وپابند ہے۔

مذہب کی زبان میں، اسی عظیم الشان، اعلیٰ وبرتر توانائی کو ''خدا'' کہتے ہیں۔ جس کی مختلف النوع طاقتوں کی لہریں اس کائنات میں گوناگوں شکلوں میں سرگرم عمل ہیں، اور کوئی چیز بھی ان کے دائرہ اختیار یا گرفت سے باہر نہیں ہے۔ جسے مذہب کی زبان میں فرشتے یا ملائکہ کہتے ہیں۔

سائنس کی زبان میں اس اعلیٰ وبرتر توانائی کو کوئی نام دیا جاسکتا ہے تو وہ ہے ''ہُو'' (HU) اور اس کی پیدا کردہ دیگر قوتوں کو فطری توانیاں، یا نیچرل اور یونیورسل انرجیز کہتے ہیں۔

یہاں ہمیں جو کچھ بھی نظر آتا ہے تو وہ سب ان ہی فطری قوتوں کی مختلف جامد وکثیف شکلیں ہیں، جبکہ توانائی بجائے خود نہایت لطیف ومنزہ ہوتی ہے جو بظاہر نظر نہیں آتی۔ البتہ افزائش وحیات، اور حرکت وعمل کے ذریعہ ہم اسے محسوس کرسکتے، اور بخوبی پہچان سکتے ہیں۔ ہر شئے کے اندر یہی طاقت وانرجی پوشیدہ ہوتی ہے۔

یہاں ایک تو مادہ (میٹریل) ہے اور دوسرے روح یعنی (انرجی) پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ مادہ الگ چیز ہے اور روح الگ چیز لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر مادہ روح ہی کی بدلی ہوئی، کثیف وثقیل شکل ہے۔ چنانچہ ہر مادہ میں روح موجود ہوتی ہے، جو مختلف کثافتوں کے سبب مادے کا ڈھیر بن جاتی ہے۔ لیکن نہ مادہ میں چھپی روح نظر آتی ہے، نہ ہی روح کا مادہ بنتا دکھائی دیتا ہے۔

مادہ چونکہ ٹھوس وجامد ہوتا ہے اس لئے آنکھوں کو نظر آتا ہے، لیکن روح چونکہ لطیف اور مادہ وکثافت سے پاک ہوتی ہے اس لئے نظر نہیں آتی، حالانکہ ہر شئے کی اصل یہی ان دیکھی روح یا انرجی ہی ہوتی ہے۔ جو دنیا دار ہوتے ہیں وہ ہمیشہ میٹریل کے پیچھے بھاگتے ہیں یا یوں سمجھیں کہ دنیاداران ہی کو کہتے ہیں جن کی نگاہیں ظاہری اور مادی اشیاء تک ہی محدود رہتی ہے جو پوشیدہ حقیقتوں کو نہیں جانتے۔ درپردہ انرجی سے ناواقف ہوتے ہیں۔

چنانچہ دنیا میں جتنے نبی، رسول، سنت، رشی منی آئے تو وہ ظاہر بین نگاہوں کو حقیقت آشنا بنانے انسانوں کو اسی اعلیٰ وبرتر توانائی سے متعارف وروشناس کرانے اور اس سے ہم آہنگ ومربوط کرنے آئے تھے تاکہ انسان اس سے باہم مربوط ہوکر خود بھی فائدہ اٹھائے، اور دوسروں کو بھی زیادہ سے زیادہ فیض پہنچائے۔

اور تاکہ لوگ جیتے جی اپنے اندر چھپی اس پاکیزہ انرجی کو پہنچانیں، اس کا تزکیہ ونشونما کریں اور اپنے انسانی وجود کو پاکیزہ انرجی میں تبدیل کرنے میں کامیاب ہوجائیں اور دنیا میں اسی کا نمونہ وپیکر بن کر جئیں۔ کیونکہ یہی اصل اور باقی رہنے والی ہے۔

عقلمند وہی ہے جو میٹریل سے کام تو لے۔ لیکن اس کے لالچ میں نہ پھنسے اور اپنی جملہ صلاحیتیں اس برتر وبالا توانائی کو پانے اور اسی کا نمائندہ بننے میں خرچ کردے۔ ورنہ یاس ومحرومی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ اور انسانی شکل میں موجود توانائی پھر بکھر کر رہ جائے گی۔

''ہُو'' (HU) انرجی اور اس کی مختلف قوتوں کا ایک عظیم

الشان اور مضبوط و مستحکم نظام ہے جو پوری کائنات میں جاری وساری ہے۔کل کائنات اسی نظام کے ماتحت کام کررہی ہے اوراسی نظام میں جکڑی وبندھی ہوئی بھی۔

کائنات کی اسی سپر پاور،اعلیٰ وبرتر توانائی ''ہو'' کو ماننے والے کو ''مومن'' اورشعوری طور پر اسی کے تابع وفرماں بردار ہوجانے والے کو ''مسلم'' کہتے ہیں۔جو پوری طرح اس سے ہم آہنگ ومربوط ہوجائے اور خود بھی وہی کردار نبھائے اسے 'متقی' اوراسی کے مطابق دوسروں کے لئے نفع بخش وصلاحیت مندکام انجام دینے والے کو ''صالح'' کہتے ہیں۔

'اس' کے سواکوئی حکمراں ،یعنی ''الہٰ'' نہیں ہے۔سب اس کے محکوم یعنی ''عبد'' ہیں اورحقیقی معنوں میں اسی کے ماتحت ومحکوم رہ کرزندگی بسر کرنا ہی ''عبادت'' ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس اعلیٰ وبرتر توانائی ''ہو'' سے وابستہ ومنسلک اورشعوری طور پرہم آہنگ ومربوط ہوجانے کے بعدانسان میں غیرمعمولی خوبیاں اور عجیب وغریب طاقتیں پیداہوجاتی ہیں اور بے شمارجسمانی ، دماغی ،قلبی ،ذہنی اورنفسیاتی بیماریوں سے چھٹکارامل جاتا ہے۔حسن وخوبصورتی میں اضافہ ہوتا،اور عمرڈھلنے کے باوجود صحت وتوانائی برقرار رہتی ہے۔رنج وغم ،فکرو پریشانی، الجھن اورٹنشن سے نجات حاصل ہوجاتی ہے۔

ایسا شخص ہرمیدان میں بے مثال کامیابیاں حاصل کرتا اور سکھ شانتی امن وسلامتی ،راحت وچین کی نعمتوں سے مالامال ہوجاتا ہے۔اپنے آپ کو پہچان لیتا ہے زندگی کے حقیقی مقصدکو پالیتا ہے اور نہ صرف اپنے اندر چھپی صلاحیتوں کو بلکہ اپنے بیرون اطراف میں اور کائنات کی وسعتوں میں موجود قدرتی توانائیوں سے بھی باخبر ہوجاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس اعلیٰ وبرتر توانائی سے مربوط ومنسلک کیسے ہوں؟ تو معلوم ہوکہ قدرت نے یہاں ہرچیز میں دوطرح کی قوتیں موجود رکھی ہیں۔ایک قوت جذب واخذ۔جس کے تحت یہاں ہر شئے اپنی حیات وبقا کا سامان زمین سے بھی،اورآسمان کی وسعتوں سے بھی مسلسل حاصل کئے جارہی ہے،اوردوسری قوت تاثیر جس کے سبب ہرچیز اپنے اوصاف وخصوصیات سے دوسروں کومتاثر کرتی،اثرانداز ہوتی اورفائدہ وفیض پہنچاتی ہے۔

یہی دونوں قوتیں قدرت نے بڑی فیاضی کے ساتھ ''انسان'' کوبھی عطا کررکھی ہیں جنہیں اجلا،پاکیزہ اور کار آمد بنا کراوراپنی اس قوت جذب کشش کوحسب استعداد زیادہ سے زیادہ مضبوط،اورتوانا کرکے خودبھی فائدہ اٹھایاجاسکتا ہے اور دوسروں کوبھی بے پناہ فائدہ پہنچایا جاسکتا ہے۔

ہرانسان کی فطرت قدرتاً (HU) انرجی سے ہم آہنگ ومانوس ہوتی ہے۔لیکن نفسانی جذبات،خودغرضی ولالچ ،دنیا کی حرص وہوس،اوردوسری بہت ساری اخلاقی برائیوں تلے دب کر،کچل کریاتو اس کا یہ تعلق وکنکشن کمزور پڑجاتا ہے،یاپھر بالکل ہی ٹوٹ کرمنقطع ہوجاتا ہے۔چنانچہ کچھ خاص مشقوں کےذریعہ تمام غیرفطری بوجھ وبار کو ہٹا کر فطری صلاحیتوں کودوبارہ اجاگر کیاجاسکتااورخودکو'ہو' انرجی اوراس کےنظام توانائی سے جوڑاجاسکتا ہے۔

کوئی بھی شخص کائنات کی اعلیٰ وبرتر توانائی ''ہو' اوراس کے نیچرل انرجیز سسٹم سے ہرگزنہیں جڑسکتا،اورنہ ہی فطری توانائیوں کومسخر کرکےان سے فائدہ اٹھاسکتاہے،جب تک کہ وہ اپنے آپ کو پوری طرح خالی نہ کرلے،تمام غیرفطری عقائدواعمال سے اخلاقی برائیوں سے،جملہ آلائشوں اورکثافتوں سے دستبردارنہ ہوجائے۔

اسی لئے اسلام کی بنیاداور پہلی سیڑھی ''کلمہ'' ہے جس میں سب سے اولین شرط ''لا''یعنی ''نہیں'' ہے۔اس اعلیٰ وبرتر توانائی ،یا مذہبی زبان میں خداکے سوا آپ پرکوئی حکمراں نہ ہو۔نہ کوئی غیر،اور نہ ہی آپ کااپنانفس ، جذبات ،خواہشات ،مرضی اورخوشی۔''اس'' کےسواہرایک کی،خصوصاً اپنے وجودکی،اپنے نفس وانا کی نفی اورقربانی ناگزیر ہے۔جس کے بغیر خدا کو پانا وپہچاننا ممکن نہیں ہے۔نفس وانا کاغلام کبھی بھی خدا کونہیں پاسکتا۔

دوسری بات یہ کہ جس طرح پتھریلی وبنجر زمین، سر سبز اور شاداب نہیں ہوسکتی۔ نرم ملائم اور قابل کاشت زمین ہی لہلہاتی اور اس میں سے کونپلیں پھوٹ سکتی ہیں۔ تو ٹھیک اسی طرح قدرتی توانائیاں بھی اس شخص کو کوئی فیض نہیں پہنچا پاتیں جس میں کسی طرح کی کوئی سختی واکڑن موجود ہو جب تک کہ وہ نرم ملائم اور قابل جذب نہ ہوجائے۔ چنانچہ خدا کو پانے اور پہچاننے کے لئے انسان کا نرم ملائم ، عاجز وخاکسار ہونا بھی نہایت ضروری ہے، جو نرم، عاجز وخاکسار نہیں وہ خدا سے اور خدا کی نعمتوں سے ہمیشہ محروم رہتا ہے۔

قوت وتوانائی خواہ کتنی ہی زبردست ہوا گر وہ بکھری ہوئی اور منتشر حالت میں ہوگی تو کبھی کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی، اور نہ ہی اس سے کوئی بڑا اور مفید کام لیا جاسکتا ہے۔ سورج کی توانائی حالانکہ بہت سخت وشدید ہوتی ہے، لیکن ہر کسی کو جلا کر راکھ نہیں کرسکتی ہے، اس لئے کہ وہ بکھری ہوئی حالت میں ہوتی ہے۔ لیکن اگر اسی بکھری دھوپ کا کچھ حصہ شیشے وغیرہ کے ذریعہ یکجا اور ایک نقطے پر مرکوز کردیا جائے تو یہی پوائنٹیڈ دھوپ جس چیز پر پڑے گی اسے جلا کر راکھ کردے گی۔

چنانچہ ''ایک خدا'' کو پانے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے خود کو ''ایک'' اور پوائنٹیڈ بنانے کی کوشش کی جائے۔ جو خود ''ایک'' نہ ہو وہ کبھی بھی ''اس'' ایک کو نہیں پاسکتا۔

یہاں کائنات میں ہر چیز مسلسل گردش کررہی ہے اور کوئی چیز بھی ساکن نہیں ہے۔ جو چیزیں گردش کررہی ہیں وہ سب ''مخلوق'' ہیں اور جو گردش نہیں کررہی، اپنی جگہ ساکن اور قائم ہے، جس کے گرد سب کچھ گردش کررہا ہے، وہ ''خدا'' ہے۔

اس ایک اکیلے خدا کو پانے کی بہترین تدبیر یہ ہے کہ خود بھی ساکن وقائم ہونے کی کوشش کی جائے، اور اس کی سب سے اعلیٰ تدبیر ''توجہ'' ہے۔ حد درجہ انہماک، یکسوئی، لگن ودھیان سے ''توجہ'' پیدا کرنے اور اس میں خوبی وکمال حاصل کرنے کے بعد ہی انسان میں خوبیاں پیدا ہوئیں اور وہ کائناتی قوتوں کا نہ صرف علم حاصل کرتا ہے، بلکہ ان سے رابطہ وتعلق قائم کرکے ان سے کام لینا بھی سیکھ لیتا ہے۔ بہت سارے غیبی علوم، کائناتی اسرار ورموز اس پر عیاں ہوجاتے ہیں اور بے شمار غیبی مناظر وندائے غیبی اس پر آشکارا ہونے لگتے ہیں۔

توانائی دراصل مادہ وشکل سے پاک اور سراسر ''نور'' ہوتی ہے۔ ''وہ'' اعلیٰ وبرتر توانائی جسے خدا کہتے ہیں وہ خود بھی آسمانوں اور زمین کا ''نور'' ہے۔ لہٰذا اس اعلی وبرتر توانائی کو پانے وپہچاننے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے خود بھی مادہ سے پوری طرح پاک ومنزہ ہونے کی کوشش کی جائے۔ جیسے جیسے انسان ''خود'' سے دور ہوتا جاتا اور اپنی توجہ کو خدا سے جوڑتا جاتا ہے تو قدرتاً وہ دھیرے دھیرے بجائے خود ''نورانی پیکر'' میں تبدیل ہونے لگتا ہے اور یہی وہ ''نورانی پیکر'' ہے جسے موت نہیں، جو ہمیشہ باقی رہنے والا ہے لیکن جیتے جی اس کا تزکیہ کرلینا نہایت ضروری ہے۔

اس کے بعد انسان میں سچ مچ معمولی خوبیاں اور صلاحیتیں پیدا ہوجاتی ہیں، بے انتہا قلبی سکون اور سچی روحانی خوشی نصیب ہوتی ہے، رنج وغم اور دنیاوی فکر سے نجات حاصل ہوجاتی ہے۔ بہت ساری جسمانی، روحانی، ذہنی اور نفسیاتی بیماریوں سے چھٹکارا مل جاتا ہے، تمام الجھنیں اور دماغی ٹنشن دور ہوجاتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ دوسروں کے لئے نفع مند بن جاتا ہے۔

لیکن یہ سب کچھ حق کا پیغام پہنچانے، حق سے روشناس کرانے، بندوں کو حق سے جوڑنے والے، داعی حق کی مکمل ، سرتاپا اطاعت کے ذریعہ ہی ممکن ہے وہی آپ کو حق کی بنیاد پر حق سے جوڑ سکتا ہے، جو خود واقعی زمانے میں ''حق'' کا نمائندہ ہو۔

☆☆☆

کلمہ شہادت.......خزینۃ المعارف

عبدالرحمٰن مصری

یہ کلمہ شہادت کیا ہے ایک خزینۃ المعارف ہے جو ہمارے آقا اور سردار حضرت نبی کریم ﷺ نے اپنی امت کو عطا کیا ہے توحید جو تمام نیکیوں کی کنجی ہے اور تمام برائیوں کو جڑ سے اکاڑ دینے کا واحد ذریعہ ہے اس کا روزانہ پانچ وقت اس زور شور سے اعلان اور ہر مسلمان کی زبان سے روزانہ اتنی مرتبہ اقرار ایک ایسا اعلان اور ایسا اقرار ہے جس کی نظیر دنیا کے کسی مذہب کی تعلیم میں نہیں پائی جاتی اور یقیناً ایک امر کا اس قدر اعادہ قلوب میں اس امر کو راسخ کردینے کا بہترین ذریعہ ہے یہ ایسا طریق تھا کہ جس سے توحید الٰہی مسلمان کے رگ وریشہ میں رچ جانی چاہئے تھی اور خدا کے فضل سے اکثر مسلمانوں کے دل اس سے معمور بھی ہیں لیکن بعض ناسمجھ اور جاہل مسلمان ایسے بھی ہیں جو اس حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بعض ایسے عقائد اور افعال کے مرتکب نظر آتے ہیں جو اس شہادت کے بالکل منافی ہیں کوئی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدائی صفات میں شریک ٹھہرا رہا ہے تو کوئی اپنے بعض پیروں کی طرف خدائی صفات منسوب کررہا ہے حالانکہ اس شہادت کے دوسرے حصہ میں واضح الفاظ میں اس امر کی نفی کی گئی ہے کہ کوئی انسان بھی خواہ وہ خدا کے ہاں کتنا بلند مرتبہ کیوں نہ رکھتا ہو کسی امر میں بھی خدا کے ہم پلہ نہیں ہوسکتا۔

محمد رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر تو نہ کوئی انسان ہوا ہے اور نہ قیامت تک ہوسکتا ہے جب ان کے متعلق بھی ہم علی الاعلان یہ کہتے ہیں اور زبان سے متعدد مرتبہ اقرار کرتے ہیں کہ وہ محض خدائے وحدہ لاشریک کے صرف بندے اور صرف اس کے رسول ہی ہیں تو پھر اور کون انسان ایسا ہوسکتا ہے، جو بندگی اور رسالت کی حدود کو پھلانگ کر الوہیت کے دائرہ میں جاداخل ہو جب انسان جو اشرف المخلوقات اور ساری کائنات کا مخدوم ہے وہ ایسا نہیں ہوسکتا تو کائنات کی کوئی دوسری چیز کس طرح یہ حق رکھ سکتی ہے کہ انسان اس کے آگے سجدہ ریز ہو اور اس کی پرستش کرے پس شہادت کے پہلے حصہ نے اگر توحید الٰہی کو مسلمانوں کے دلوں میں رچایا ہے تو اس کے دوسرے حصہ نے شرک کا جو تمام برائیوں کی جڑ اور تمام نیکیوں سے دور رکھنے کا ذریعہ ہے قطعی طور پر قلع قمع کردیا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کا حقیقی مقصد

انسانوں کو توحید پر قائم کرنا اور انہیں شرکت سے مجتنب رکھنا ہی ایک مقصد ہے جس کے لئے دنیا میں انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوتے رہے ہیں اور اس مقصد کو جس خوبی اور جس کمال کے ساتھ حضرت نبی کریم ﷺ نے پورا کیا ہے وہی سب سے بڑی اور روشن دلیل ہے اس بات پر کہ آپ ﷺ ہی خاتم النبیین ہیں کیونکہ نبیوں کے کام اور ان کے مشن کو آنحضور ﷺ نے اس کے انتہا تک پہنچا دیا اور انتہا کے بعد اور کوئی مقام ہی نہیں جس تک انسانوں کو پہنچانے کے لئے کسی اور نبی کی ضرورت پیش آئے صرف بوقت ضرورت اس کی طرف توجہ دلانے اور اسی کو یاد کرانے کے لئے مجددین کی ضرورت پیش آتی ہے اور آتی رہے گی جس کا انتظام شریعت غرا نے کردیا ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ ان اللّٰہ یبعث لهذه الامة علی رأس کل مائة سنة من یجدد لها دینها اور قرآن شریف نے آیت استخلاف میں ایسے امتیوں کو خلفاء کا نام دیا ہے۔

اس کلمہ شہادت کی اس نقطہ نگاہ سے اگر مکمل تفسیر کی جائے تو

اس کے لئے ایک مبسوط کتاب بھی کافی نہیں ہوسکتی۔لہذا اس مقالہ میں اپنے قارئین کو صرف ایک امر کی طرف توجہ دلانا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر شخص جانتا ہے کہ شہادت اسی چیز کی دی جاتی ہے جس کو انسان نے خود دیکھا ہو یا کسی اور حس کے ذریعہ وہ اس کے ذاتی تجربہ میں آئی ہو یا اس چیز کے متعلق کسی ایسے شخص کی رویت ہو یا اس کے تجربہ میں وہ چیز آئی ہو جس کی صداقت پر اس کو کلی اعتماد ہو پس ایسے شخص کی شہادت کی بنا پر بھی اس چیز کے موجود ہونے پر یقین کر لیا جاتا ہے جیسا کہ انگلینڈ سے آیا ہوا شخص جب اس کے وجود کا یقین دلاتا ہے تو جو لوگ وہاں نہیں گئے وہ اس کی شہادت پر یقین کرتے ہوئے انگلینڈ کے وجود کو نہ صرف مان لیتے ہیں بلکہ دوسروں کو منوانے کے لئے بھی تیار ہو جاتے ہیں۔

کلمہ شہادت میں ایک پیشگوئی

پس مندرجہ بالا اصول کے ماتحت اگر ہم واقعات پر نظر ڈالیں تو لامحالہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ ہر مسلمان جو خدا کی وحدانیت اور محمد ﷺ کی رسالت کی شہادت دیتا ہے تو اس کی بناء اس کی اپنی رویت یا اپنے ذاتی تجربہ پر نہیں ہوتی اس لئے لازماً ہمیں ماننا پڑے گا کہ امت میں ضرور بالضرور ایسے آدمی پیدا ہوتے رہیں گے جو اپنی رویت یا اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر دوسرے لوگوں کو یقین دلائیں گے کہ خدا فی الحقیقت موجود ہے، اور وہ یقینی طور پر وحدہ لاشریک ہے اور یہ کہ محمد ﷺ بلا شک وشبہ خدا کے آخری پیغمبر ہیں جن کے فیوض قیامت تک جاری ہیں اور جن کے فیوض کی بدولت ہی انسان قرب الٰہی کی منازل طے کر کے مقرب الٰہی بن سکتا ہے ورنہ بغیر اس کے ،شہادت،شہادت کہلانے کی مستحق ہی نہیں ہوسکتی اور نہ اس کی کوئی وقعت ہوسکتی ہے اور نہ اس پر اعتبار کیا جاسکتا ہے اور نہ غیر مسلموں پر اس کے ذریعہ کوئی حجت قائم کی جاسکتی ہے، یہاں تو لوگ خدا کی ہستی کے ہی قائل نہیں، چہ جائیکہ اس کی وحدانیت کو تسلیم کریں اور پھر محمد ﷺ کو اس کا رسول مانیں اور پھر اس لائی

ہوئی کتاب قرآن کریم کو خدا کی کتاب یقین کریں اس پر اس کے رسول کے اسوہ کے مطابق عمل کرنے کو ہی ذریعہ نجات سمجھیں کیونکہ ایسی شہادت جس پر رویت یا تجربہ کی مہر نہ لگی ہو، اس کی حیثیت محض دعویٰ کی حیثیت ہوگی جو بغیر دلیل درخور اعتنا ہی نہیں سمجھا جاتا چہ جائیکہ اسے قبول کیا جائے۔

پس اگر مسلمانوں کی یہ شہادت،شہادت حقہ ہے تو ماننا پڑے گا کہ کلمہ شہادت میں امت میں ایسے لوگوں کے پیدا ہونے کی پیشگوئی ضرور مضمر ہے جو اپنی رویت اور تجربہ کی بنا پر اس شہادت حقہ کو ادا کرنے والے ہوں گے اور وہ اپنی رویت اور تجربہ کا عملی ثبوت پیش کر کے دوسرے لوگوں کو اپنی شہادت کے سچا اور مبنی بر حقیقت ہونے کا یقین دلائیں گے تا ان کی شہادت بھی شہادت حقہ کے لباس میں ملبوس ہو جائے۔

عملی ثبوت کی علامات

اور وہ عملی ثبوت اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا کہ مقربان الٰہی کی جتنی علامتیں قرآن کریم نے بیان کی ہیں وہ سب ان میں پائی جاتی ہوں تا ان کے راست باز ہونے پر لوگوں کو یقین آ جائے ۔چنانچہ اس غرض کو پورا کرنے کیلئے اسلام امت محمدیہ میں مجددین اور خلفاء کے سلسلہ کو قائم کیا ہے ہر زمانہ میں ضرورت کے وقت امت میں ایسے نائب رسول پیدا ہوتے رہے ہیں جن کو حضرت نبی کریم ﷺ کے ظل اور بروز کے نام سے پکارا جاتا ہے۔جنہوں نے خدا کی وحدانیت اور محمد ﷺ کی رسالت کی صداقت پر ایسے عملی ثبوت بہم پہنچائے جن کی بنا پر ہر مسلمان دلی یقین کے ساتھ نہ صرف رسم کے طور پر شہادت حقہ کو ادا کرتا ہے بلکہ جس کے ذریعہ غیر مسلموں پر بھی حجت قائم کی جاتی رہی۔

قرآن اور حدیث میں اس کا ثبوت

اس حقیقت کی طرف حدیث لم یبق من النبوۃ الا المبشرات اشارہ کر رہی ہے جس کے متعلق حدیث میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں یرا ھا المومن او تری لہ یعنی بعض

مومنوں کو خود براہ راست ان مبشرات کا تجربہ ہوتا ہے، اور دوسرے مسلمان ان کے تجارب سے فائدہ اٹھاتے ہیں قرآن کریم میں بھی ایسے مومنوں کے متعلق جو یراہا کے مصداق ہوتے ہیں یہی آیا ہے کہ ان پر روح القدس نازل ہوتا ہے، فرشتے اترتے ہیں، ان کو بشارتیں دیتے ہیں ان کو ایسی غیب پر مشتمل خبروں پر مطلع کیا جاتا ہے، جن تک انسانی علم کی رسائی نہیں ہوسکتی اور وہ پوری ہوکر خدا کی ہستی پر یقین دلا دیتی ہیں ان کی اکثر دعائیں قبول ہوتی ہیں اور بڑے بڑے اہم امور میں قبول ہوتی ہیں خوارق ان کے ہاتھ پر ظاہر ہوتے ہیں ان پر قرآن کے حقائق ومعارف کثرت سے کھلتے ہیں، خصوصاً مقابلہ کے وقت جو دوسروں پر نہیں کھلتے ان کی مدد سے وہ مخالفین اسلام کے اعتراضوں کا دندان شکن جواب دیتے ہیں اور جن کے ذریعہ سے وہ قرآن کریم کی خوبیوں کو ایسا اجاگر کرتے ہیں جو دوسروں کو اپیل کرسکیں اور ان کو اسلام کی طرف کشش کرنے کا باعث بن سکیں ان کو دشمنان اسلام کے مقابلہ پر اسلام کا غلبہ ظاہر کرنے کیلئے فرقان عطا کیا جاتا ہے، اور ہر میدان میں ان کو غالب رکھا جاتا اور دشمن کو مغلوب کیا جاتا ہے ان کو ایسی قوت قدسیہ عطا کی جاتی ہے جو ان کے ساتھ دلی تعلق پیدا کرنے والوں کے دلوں کو پاک وصاف کرنے میں زبردست تاثیر رکھتی ہے، پس یہ سب امور مل کر ان کی شہادت کے متعلق دوسروں کو یقین دلا دیتے ہیں کہ وہ شہادت حقہ ہے اور یہ لوگ جو کچھ کہہ رہے ہیں رویت اور تجربہ کی بنا پر کہہ رہے ہیں۔

ایسے لوگوں کا دائمی وجود

ایسے لوگ امت میں ہمیشہ پیدا ہوتے رہے ہیں اور عوام کو صراط مستقیم پر قائم رکھنے کا ذریعہ بنتے رہے ہیں لیکن ان کے ذکر کی اس جگہ ضرورت نہیں، شاید لوگ ان کو قصہ سمجھ کر ان کی طرف توجہ نہ کریں اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس زمانہ میں بھی جبکہ خدا کی ہستی کا انکار اس قدر زور وشور سے کیا جارہا تھا اور رسولوں اور ان کی لائی ہوئی الہامی کتب پر اس قدر ہنسی اڑائی جارہی تھی کہ اس کی نظیر پہلے کسی زمانہ میں نہیں ملتی۔ امت محمدیہ میں ایک عظیم الشان مجدد جسے حدیثوں میں مسیح اور مہدی کا لقب بھی دیا گیا ہے مبعوث فرما کر مندرجہ بالا تمام امور کو اس کے وجود میں جمع کر دیا اور اس طرح مسلمانوں کو علی وجہ البصیرت کلمہ شہادت منہ سے نکالنے کے قابل بنا دیا، اس کی ہر ایک پیشگوئی نے اللہ تعالیٰ کی کسی نہ کسی صفت کو نمایاں طور پر دنیا میں بھی کام کرتے ہوئے ثابت کر دیا اور صفات ہی ایسی چیز ہیں جن کا وجود موصوف کے وجود پر یقینی دلیل کا کام دیتا ہے کیونکہ صفات موصوف سے الگ شئے نہیں ہوتیں۔ پس کلمۂ شہادت میں مضمر پیشگوئی اس زمانہ میں حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانیؑ کے وجود میں پوری ہوگئی اور اس نے پورا ہوکر اسلام کی اور رسول کریم ﷺ کی صداقت پر چار چاند لگا دئے کیونکہ انہوں نے جو کچھ پایا قرآن کریم کی کامل پیروی اور محمد رسول اللہ ﷺ کی محبت اور آنحضرت ﷺ کی اطاعت میں فنا ہوکر ہی پایا ہے کیونکہ اگر رسول اللہ ﷺ کی قوت قدسیہ کی تاثیریں ان کے کامل متبع کے وجود میں اس زمانہ میں بھی ظاہر نہ ہوتیں تو پھر اس زمانہ میں ان کی رسالت کے اقرار کی اس سے زیادہ اور کوئی حقیقت نہیں رہتی کہ ہم ایک تاریخی واقعہ کا اقرار کرتے جو گذر چکا ہے جس طرح کہ ہم دوسرے گذرے ہوئے رسولوں کی رسالت کا اقرار کرتے ہیں۔ ویسے ہی آنحضرت ﷺ کی رسالت کا اقرار بھی اس سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا پس اگر آج مسلمان اس سے الگ ہوکر کلمہ شہادت پڑھتے ہیں تو علی وجہ البصیرت نہیں بلکہ رسم کی اتباع میں پڑھتے ہیں کیونکہ ان کے پاس اس شہادت کا کوئی عملی ثبوت موجود نہیں۔ کاش ہمارے مسلمان بھائی اس پر غور کریں اور رسم کو چھوڑ کر بصیرت سے اپنی جھولیاں بھرنے کی سوچیں۔

توحید کے تین درجے

امام الزماں حضرت مسیح موعودؑ جن کے ظہور کے پیشگوئی کلمہ

شہادت کی حقیقت میں مضمر ہے۔اپنی کتاب ''آئینہ کمالات اسلام'' میں توحید کے متعلق فرماتے ہیں۔''یادر ہے کہ توحید کے تین درجے ہیں سب سے ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ اپنے جیسے مخلوق کی پرستش نہ کریں، نہ پتھر کی، نہ آگ کی، نہ آدمی کی، نہ کسی ستارہ کی۔دوسرا درجہ یہ ہے کہ اسباب پر بھی ایسا نہ گریں کہ گویا ایک قسم کا ان کو ربوبیت کے کارخانہ میں مستقل دخل قرار دیں۔بلکہ ہمیشہ سبب پر نظر رہے، نہ اسباب پر(آپ کی بیان کردہ اس حقیقت کی تائید سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس قول سے ہوتی ہے اذا مرضت فهو يشفين (الشعراء: آیت۸۰) ظاہر ہے کہ مرض تو ادویہ استعمال کرنے سے دور ہوتی ہے لیکن حضرت ابراہیم شفا کو ڈاکٹروں اور ادویہ کی طرف منسوب کرنے کی بجائے اسے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں گویا مسبب حقیقی اسباب کی بجائے خداوند تعالیٰ کو ہی ٹھہراتے ہیں اور یہی حقیقی توحید ہے اسی طرح حضرت نبی کریم ﷺ نے بارش کے متعلق فرمایا کہ جو اسے ستاروں کی طرف منسوب کرتا ہے اور ان کی تاثیروں کو اس کا ذریعہ ٹھہراتا ہے وہ ستاروں کا مومن اور اللہ کا کافر ہے اور جو اللہ کی رحمت کی طرف اسے منسوب کرتا ہے وہ اللہ کا مومن اور ستاروں کا کافر ہے۔پس حقیقی موحد وہی ہے جو اسباب سے گو کام لیتا ہے لیکن ان سے پیدا شدہ نتائج کو صدق دل سے خدا کی طرف منسوب کرتا ہے۔حضرت مرزا صاحب کی تحریر کا یہی مطلب ہے۔حضرت عمرؓ کا قول نعم افر من قدرالله الى قدرالله کو بھی اس سلسلہ میں یادرکھنا چاہیئے۔جس قدر اسباب کو اپنے اپنے مقاصد کیلئے انسان تبدیل کرے ان سب کو ''قدر اللہ'' ہی یقین کرتے ہوئے انہیں تبدیل کرے، اور ان سے فوائد حاصل کرے۔(ناقل) تیسرا درجہ توحید کا یہ ہے کہ تجلیات الٰہیہ کا کامل مشاہدہ کر کے ہر ایک غیر کے وجود کو کالعدم قرار دیں اور ایسا ہی اپنے وجود کو بھی۔غرض ہر ایک چیز نظر میں خالی دکھائی دے، بجز اللہ تعالیٰ کی ذات کامل الصفات کے دراصل یہی روحانی زندگی ہے کہ یہ مراتب ثلاثہ توحید کے حاصل ہو جائیں۔''

(حضرت مرزا صاحبؒ کے اس بیان کی تائید اس آیت سے ہوتی ہے۔افرأيت من اتخذ الٰهه هواه واضله الله على علم وختم على سمعه وقلبه وجعل على بصره غشاوة فمن يهديه من بعد الله افلا تذكرون (الجاثیۃ: آیت۲۳) اس آیت میں اللہ اور رسول کے منشاء اور ان کی ہدایات کے خلاف نفس کی خواہشات کی پیروی کرنے والے کو خدا کو چھوڑ کر اپنے نفس کے بت کی پرستش کرنے والا قرار دیا ہے، گویا مجدد زماں نے جو یہ فرمایا ہے کہ کامل توحید یہ ہے کہ ہر ایک غیر اللہ کو حتی کہ اپنے نفس کو بھی کالعدم قرار دے، یہ آیت اس کی تائید کر رہی ہے۔اس حقیقت پر دلالت کرنے والی آیات بیشمار ہیں حضرت مرزا صاحب نے مندرجہ بالا حقائق کو مزید وضاحت کے ساتھ اپنی مندرجہ ذیل تحریر میں بیان فرمایا ہے جس سے حقائق اسلام کی وضاحت ہوتی ہے، فرماتے ہیں:۔

''اصطلاحی معنی اسلام کے وہ ہیں جو اس آیت کریمہ میں اس کی طرف اشارہ ہے یعنی یہ کہ بلى من اسلم وجهه لله وهو محسن فله اجره عندربه ولا خوف عليهم ولاهم يحزنون یعنی مسلمان وہ ہے جو خدا تعالیٰ کی راہ میں اپنے تمام وجود کو سونپ دیوے یعنی اپنے وجود کو اللہ تعالیٰ کے لئے اور اس کے ارادوں کی پیروی کے لئے اور اس کی خوشنودی کے حاصل کرنے کے لئے وقف کر دے اور پھر نیک کاموں پر خدا تعالیٰ کے لئے قائم ہو جائے اور اپنے وجود کی تمام عملی طاقتیں اس کی راہ میں لگا دے۔مطلب یہ ہے کہ اعتقادی اور عملی طور پر محض خدا تعالیٰ کا ہو جائے، اعتقادی طور پر اس طرح سے کہ اپنے تمام وجود کو درحقیقت ایک ایسی چیز سمجھ لے، جو خدا تعالیٰ کی شناخت اور اس کی اطاعت اور اس کے عشق اور محبت اور اس کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے بنائی گئی ہے، اور عملی طور پر اس طرح سے کہ خالصاً للہ حقیقی نیکیاں جو ہر ایک قوت سے متعلق اور ہر ایک خداداد توفیق سے وابستہ ہیں۔

بجائے لائے۔مگر ایسے ذوق وشوق وحضور سے کہ گویا وہ اپنی فرمانبرداری کے آئینہ میں اپنے معبودِ حقیقی کے چہرہ کو دیکھ رہا ہے۔

پھر بقیہ ترجمہ کا یہ ہے کہ جس کی اعتقادی و عملی صفائی ایسی محبت ذاتی پر مبنی ہو اور ایسے طبعی جوش سے اعمال حسنہ اس سے صادر ہوں، وہی ہے جو عنداللہ مستحق اجر ہے اور ایسے لوگوں پر نہ کچھ خوف ہے اور نہ وہ کچھ غم رکھتے ہیں یعنی ایسے لوگوں کے لئے نجات نقد موجود ہے کیونکہ جب انسان کو اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات پر ایمان لا کر اس سے موافقت تامہ ہوگئی اور ارادہ اس کا خدا تعالیٰ کے ارادہ سے ہم رنگ ہوگیا اور تمام لذت اور اس کی فرمانبرداری میں ٹھہر گئی اور جمیع اعمال صالحہ نہ مشقت کی راہ سے بلکہ تلذذ اور احتظاظ کی کشش سے صادر ہونے لگے تو یہی وہ کیفیت ہے جس کو فلاح اور نجات اور رستگاری سے موسوم کرنا چاہئے اور عالم آخرت میں جو کچھ نجات کے متعلق مشہود ومحسوس ہوگا وہ درحقیقت اسی کیفیت راسخہ کے اظلال وآثار ہیں جو اس جہان میں جسمانی طور پر ظاہر ہوجائیں گے۔مطلب یہ ہے کہ بہشتی زندگی اسی جہان سے شروع ہوجاتی ہے اور جہنمی عذاب کی جڑھ بھی اسی جہان کی گندی اور کورانہ زیست ہے۔

اب آیات ممدوحہ بالا پر ایک نظر غور ڈالنے سے ہر ایک سلیم العقل سمجھ سکتا ہے کہ اسلام کی حقیقت تب کسی میں متحقق ہوسکتی ہے کہ جب اس کا وجود مع اپنے تمام باطنی وظاہری قویٰ کے محض خدا تعالیٰ کے لئے اور اس کی راہ میں وقف ہوجائے، اور جو امانتیں اس کو خدا تعالیٰ کی طرف سے ملی ہیں پھر اسی معطی حقیقی کو واپس دی جائیں اور نہ صرف اعتقادی طور پر بلکہ عمل کے آئینہ میں بھی اپنے اسلام اور اس کی حقیقت کاملہ کی ساری شکل دکھائی جائے یعنی شخص مدعی اسلام یہ بات ثابت کردے کہ اس کے ہاتھ اور پیر اور دل اور دماغ اور اس کی عقل اور اس کا فہم اور اس کا غضب اور اس کا رحم اور اس کا حلم اور اس کی تمام روحانی اور جسمانی قوتیں اور اس کی عزت اور اس کا مال اور اس کا آرام اور اس کا سرور اور جو کچھ اس کا سر کے بالوں سے پیروں کے ناخنوں تک باعتبار ظاہر وباطن کے ہے۔ یہاں تک کہ اس کی نیات اور اس کے دل کے خطرات اور اس کے نفس کے جذبات سب خدا تعالیٰ کے ایسے تابع ہوگئے ہیں کہ جیسے ایک شخص کے اعضا اس شخص کے تابع ہوتے ہیں۔

غرض یہ ثابت ہوجائے کہ صدق قدم اس درجہ تک پہنچ گیا ہے کہ جو کچھ اس کا ہے، وہ اس کا نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کا ہوگیا ہے اور تمام اعضاء اور قویٰ الٰہی خدمت میں ایسے لگ گئے ہیں کہ گویا وہ جوارح الحق ہیں۔

اور ان آیات پر غور کرنے سے یہ بات بھی صاف اور بدیہی طور پر ظاہر ہورہی ہے کہ خدا تعالیٰ کی راہ میں زندگی کا وقف کرنا جو حقیقت اسلام ہے۔دو قسم پر ہے ایک یہ کہ خدا تعالیٰ کو ہی اپنا معبود اور مقصود اور محبوب ٹھہرایا جائے اور اس کی عبادت، محبت، خوف اور رضا میں کوئی دوسرا شریک باقی نہ رہے اور اس کی تقدیس اور تسبیح اور عبادت اور تمام عبودیت کے آداب اور احکام اور اوامر اور حدود اور آسمانی قضا وقدر کے امور بدل وجان قبول کئے جائیں اور نہایت نیستی اور تذلل سے ان سب حکموں اور حدوں اور قانونوں اور تقدیروں کو بالارادہ تامہ سر پر اٹھا لیا جائے اور نیز وہ تمام پاک صداقتیں اور پاک معارف جو اس کی وسیع قدرتوں کی معرفت کا ذریعہ اور اس کی ملکوت وسلطنت کے علومرتبہ کو معلوم کرنے کے لئے ایک واسطہ اور اس کے آلاء اور نعماء کے پہچاننے کے لئے ایک قومی رہبر ہیں، بخوبی معلوم کرلی جائیں۔

دوسری قسم اللہ تعالیٰ کی راہ میں زندگی وقف کرنے کی یہ ہے کہ اس کے بندوں کی خدمت اور ہمدردی اور چارہ جوئی اور باربرداری اور سچی غمخواری میں اپنی زندگی وقف کردی جائے اور دوسروں کو آرام پہنچانے کیلئے دکھ اٹھائیں اور دوسروں کی راحت کیلئے اپنے پر رنج گوارا کریں۔اس تقریر سے معلوم ہوا کہ اسلام کی حقیقت نہایت ہی اعلیٰ ہے اور کوئی انسان کبھی اس شریف لقب اہل اسلام سے حقیقی طور پر ملقب نہیں ہوسکتا، جب تک کہ وہ اپنا سارا

وجود معہ اس کی تمام قوتوں اور خواہشوں اور ارادوں کے حوالہ بخدانہ کر دے اور اپنی انانیت سے معہ اس کے جمیع لوازم کے ہاتھ اٹھا کر اسی کی راہ میں نہ لگ جائے۔ پس حقیقی طور پر اسی وقت کسی کو مسلمان کہا جائے گا کہ جب اس کی غافلانہ زندگی پر ایک سخت انقلاب وارد ہو کر اس کے نفس امارہ کا نقش ہستی معہ اس کے تمام جذبات کے یک دفعہ مٹ جائے اور پھر اس موت کے ''بعد محسن للہ'' ہونے کی نئی زندگی اس میں پیدا ہو جائے اور وہ ایسی پاک زندگی ہو جو اس میں بجز طاعت خالق اور ہمدردی مخلوق کے اور کچھ بھی نہ ہو۔

خالق کی طاعت اس طرح سے کہ اس کی عزت وجلال اور یگانگت ظاہر کرنے کیلئے بے عزتی اور ذلت قبول کرنے کیلئے مستعد اور اس کی وحدانیت کا نام زندہ کرنے کیلئے ہزاروں موتوں کے قبول کرنے کیلئے تیار ہو اور اس کی فرمانبرداری میں ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ کو بخوشی خاطر کاٹ سکے اور اس کے احکام کی عظمت کا پیار اور اس کی رضا جوئی کی پیاس گناہ سے ایسی نفرت دلائے کہ گویا وہ کھا جانے والی ایک آگ ہے یا ہلاک کرنے والی ایک زہر ہے یا بھسم کر دینے والی ایک بجلی ہے جس سے اپنی تمام قوتوں کے ساتھ بھاگنا چاہئے۔ غرض اس کی مرضی ماننے کیلئے اپنے نفس کی سب مرضیات چھوڑ دے اور اس کے پیوند کیلئے جان کاہ زخموں سے مجروح ہونا قبول کرلے اور اس کے تعلق کا ثبوت دینے کیلئے سب نفسانی تعلقات توڑ دے۔ اور خلق اللہ کی خدمت اس طرح سے کہ جس قدر خلقت کی حاجات ہیں اور جس قدر مختلف وجوہ اور طرق کی راہ سے قسام ازل نے بعض کو محتاج کر رکھا ہے ان تمام امور میں محض للہ اپنی حقیقی اور بے غرضانہ اور سچی ہمدردی سے جو اپنے وجود سے صادر ہو سکتی ہے ان کو نفع پہنچا دے اور ہر ایک محتاج کو اپنی خداداد قوت سے مدد دے اور ان کی دنیا و آخرت دونوں کی اصلاح کیلئے زور لگا دے۔

مگر یہ للہی وقف محض اس صورت میں اسم با مسمّٰی ہوگی کہ جب تمام اعضاء الٰہی طاعت کے رنگ سے ایسے رنگ پذیر ہو جائیں کہ گویا وہ ایک الٰہی آلہ ہیں جن کے ذریعہ سے وقتاً فوقتاً افعال الٰہیہ ظہور پذیر ہوتے ہیں یا ایک مصفا آئینہ ہیں جس میں تمام مرضیات الٰہیہ بصفات تام عکسی طور پر ظہور پکڑتی رہتی ہیں اور جب اس درجہ کاملہ پر للٰہی طاعات وخدمات پہنچ جائیں تو اس صبغۃ اللہ کی برکت سے اس وصف کے انسان کے قویٰ اور جوارح کی نسبت وحدت شہودی کے طور پر یہ کہنا صحیح ہوتا ہے کہ مثلاً یہ آنکھیں خداتعالیٰ کی آنکھیں اور یہ زبان خداتعالیٰ کی زبان اور یہ ہاتھ خداتعالیٰ کے ہاتھ اور یہ کان خداتعالیٰ کے کان اور یہ پاؤں خداتعالیٰ کے پاؤں ہیں۔ کیونکہ وہ تمام اعضاء اور قوتیں للٰہی راہوں میں خداتعالیٰ کے ارادوں سے پُر ہو کر اور اس کی خواہشوں کی تصویر بن کر اس لائق ہو جاتے ہیں کہ ان کو اسی کا روپ کہا جائے۔ وجہ یہ کہ جیسے ایک شخص کے اعضاء پورے طور پر اس کی مرضی اور ارادہ کے تابع ہوتے ہیں ایسا ہی کامل انسان اس درجہ پر پہنچ کر خداتعالیٰ کی مرضیات وارادت سے موافقت تامہ پیدا کر لیتا ہے اور خداتعالیٰ کی عظمت اور وحدانیت اور مالکیت اور معبودیت اور اس کی ہر ایک مرضی اور خواہش کی بات ایسی ہی اس کو پیاری معلوم ہوتی ہے کہ جیسی خود اللہ تعالیٰ کو۔ سو یہ عظیم الشان للٰہی طاعت وخدمت جو پیار اور محبت سے ملی ہوئی اور خلوص اور حقیقت تامہ سے بھری ہوئی ہے یہی اسلام کی حقیقت اور اسلام کا لب لباب ہے جو نفس اور خلق اور ہوا اور ارادہ سے موت حاصل کرنے کے بعد ملتا ہے۔

دنیا کی تمام قوموں میں اتحاد اور یگانگت پیدا کرنے کا واحد ذریعہ توحید ہی ہے۔ اگر تمام اقوام عالم میں اس بات کا حقیقی احساس پیدا ہو جائے کہ ہم سب ایک ہی خدا کے بندے اور ایک ہی خدا کی مخلوق ہیں تو وہ الخلق عیال اللہ کے نظریہ پر ایمان لاتے ہوئے ایک دوسرے سے نہ صرف دوستانہ سلوک کریں بلکہ برادرانہ سلوک کے کرشمے ان سے ظہور پذیر ہونے لگ پڑیں اور جب ایک دوسرے کے خلاف نفرت کا اظہار ہوتا رہتا ہے یا بعض قومیں دیگر قوموں پر بڑائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کو حقارت کی نگاہ

سے دیکھتی ہیں ان تمام برائیوں کا سلسلہ ایک دم میں ختم ہو جائے، بلکہ اس کے برخلاف ایک دوسرے سے شیر وشکر ہو جائیں اور نفرت اور حقارت کی جگہ ہمدردی اور خیر خواہی کے جذبات لے لیں، جس طرح ایک باپ کی اولاد کے ایک دوسرے کے حقیقی خیر خواہ اور حقیقی ہمدرد ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کی مصیبت میں ہاتھ بٹاتے اور ایک دوسرے کی مشکلات کو دور کرنے کیلئے ایک دوسرے کی مدد میں سبقت لے جانے کی سعی میں مصروف ہو جاتے ہیں اسی طرح قومیں بھی ایک دوسرے کی مشکلات کو دور کرنے کی غرض سے بے لوث مدد کرنے میں دوڑ پڑیں، قرآن کریم نے متعدد آیات میں اس نظریہ پر خصوصیت سے زور دیا ہے کیونکہ قوموں کو متحد رکھنے کا یہی واحد ذریعہ ہے لیکن اس کے برخلاف آج کل ہو یہ رہا ہے کہ کسی قوم پر وارد شدہ مصیبت کو دور کرنے کیلئے جو قومیں آگے بڑھتی ہیں بالعموم اس میں ان کے اپنے ذاتی مفاد مدنظر ہوتے ہیں، قرضہ دیں گے تو سود اس قدر زیادہ وصول کریں گے کہ غریب قوم تمام عمر قرضہ کے بوجھ تلے ہی دبی رہے۔ اور ترقی کے تمام دروازے اس کیلئے ہمیشہ کے لئے بند رہیں حضرت نبی کریم ﷺ کے مشہور فرمان الید العلیا خیر من الید السفلی کے ماتحت ترقی یافتہ قوم ترقی پذیر ممالک سے جسے وہ قرض کے ذریعہ زیر احسان لاتی ہے اسے مجبور کرتی ہے کہ اس کی سیاسی اغراض پورا کرانے میں اس کی مدد کرے، اور وہ غریب مجبور ہے کہ اس کے اشارہ پر کام کرتا چلا جائے۔ لیکن اس کے مقابلہ میں قرآن کریم نے اس قسم کے احسان کرنے والے کے کردار کا نقشہ ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

ویطعمون الطعام علی حبہ مسکینا ویتیماً واسیراً انما نطعمکم لوجہ اللہ لانرید منکم جزاء ولاشکوراً انا نخاف من ربنا یوما عبوسا قمطریراً یعنی مومنوں کی شان یہ ہے کہ وہ باوجود مال کی محبت کے مسکینوں یتیموں اور اسیروں کو کھانا کھلاتے ہیں (مسکین یتیم اور اسیر اپنے اندر بڑا وسیع مفہوم رکھتے ہیں جس میں آج کل کی تمام غریب قومیں آجاتی ہیں) اس مالی امداد کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیتے ہوئے اپنے قول اور عمل سے یہ کہتے ہیں ہم جو تمہاری ضروریات کو پورا کرتے ہیں اس میں ہماری کوئی ذاتی غرض نہیں بلکہ خدا کی رضا کے حصول کو مدنظر رکھتے ہوئے ایسا کرتے ہیں ہم اپنی اس امداد پر آپ سے کسی جزا کے خواہشمند نہیں، جزاء تو بڑی چیز ہے ہم تو اس کے بھی روادار نہیں کہ آپ لوگ ہمارے حق میں شکریہ کے الفاظ ہی استعمال کریں قرآن کی دوسری آیت میں ایسے مومنوں کی شان میں فرمایا ہے ولوکان بھم خصاصہ اگرچہ وہ خود بھی حاجت مند ہوں یعنی اپنی حاجتوں اور ضرورتوں پر دوسروں کی حاجتوں اور ضرورتوں کو ترجیح دیتے ہیں اسی ایک اور آیت میں مومنوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ لاتبطلوا صدقاتکم بالمن والاذی یعنی جس کی مدد کرتے ہو نہ ان پر احسان جتاؤ اور نہ انہیں کسی قسم کی ایذا رسانی کا نشانہ بناؤ اگر ایسا کرو گے تو تمہارے یہ صدقات باطل ہو جائیں گے یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم کسی اجر کے مستحق نہیں ہو گے۔ مندرجہ بالا کردار کے مقابلہ میں ترقی یافتہ قومیں ترقی پذیر قوموں کے ساتھ جس کردار یا جس سلوک کا آج کل مظاہرہ کر رہی ہیں قرآن شریف نے اس کا نقشہ مندرجہ ذیل الفاظ میں پیش کیا ہے۔ ویل للمطففین الذین اذااکتالوا علی الناس یستوفون واذا کالوھم اووزنوھم یخسرون یعنی ان لوگوں کے لئے فضیحت اور تباہی ہے جب وہ دوسروں سے ان کی اشیاء لیتے ہیں تو پوری لیتے ہیں لیکن جب ان کو اپنی اشیاء دیتے ہیں تو اس خرید و فروخت میں ان کو نقصان پہنچاتے ہیں یعنی اپنی اشیاء کی بھاری قیمت وصول کرتے ہیں اور ان کی اشیاء سستے داموں پر خریدتے ہیں۔ آج ترقی یافتہ ملکوں کی طرف سے لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہے، اس ساری دھاندلی کی وجہ یہی ہے کہ بعض قومیں دوسری قوموں کو اپنا جیسا انسان نہیں سمجھتیں، اپنے مقابلہ میں ان کو حقیر اور ذلیل یقین کرتی

ہیں اس احساس کو مٹانے اور اس کا قلع قمع کرنے کے لئے قرآن کریم نے ایسی قوموں کو خاص طور پر مندرجہ ذیل آیات میں متنبہ کیا ہے، فرماتا ہے: یاایھاالذین آمنوا لایسخر قوم من قوم عسٰی ان یکونوا خیراً منھم. کوئی قوم دوسری قوم کو حقیر نہ سمجھے، ہوسکتا ہے کہ وہ (اپنی صلاحیتوں کی رو سے) ان سے بہتر ثابت ہو۔ ایسا کرنے والے ظالم ہیں فرمایا ولقدکرمنا بنی آدم دیکھو تم سب آدم کی اولاد ہو، ہم نے آدم کی تمام اولاد کو قابل عزت بنایا ہے۔ اس لئے کسی ایک حصہ اولاد کو دوسرے حصہ اولاد کو حقیر قرار دینے یا ذلیل سمجھنے کا حق نہیں، پھر فرمایا یاایھاالناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ. دیکھو اے لوگو! تمہارے رب نے سب انسانوں کی پیدائش ایک جیسے نفس سے کی ہے اس لئے پیدائش کے لحاظ سے بڑے اور چھوٹے کے درمیان کوئی فرق نہیں، پس ایک دوسرے کے ساتھ سلوک کرتے وقت اپنے رب کی ناراضگی اور اس کی سزا سے ڈرتے رہو، کسی بڑے کو چھوٹے کو حقیر خیال کرنے کا حق نہیں فرمایا۔ یاد رکھو یاایھاالناس اناخلقناکم من ذکر وانثیٰ وجعلناکم شعوبا وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم ان اللہ علیم خبیر

یہ مختلف قبائل وغیرہ جو تمہیں نظر آتے ہیں یہ محض ایک دوسرے کی شناخت کا ذریعہ ہیں باقی معزز تو تم میں سے قومیت کی وجہ سے نہیں، رنگ و نسل کی وجہ سے نہیں، بلکہ خدا کے حقوق اور بندوں کے حقوق کو کماحقہ ادا کرنے والا ہی حقیقی عزت کا مستحق ہوسکتا ہے (سورہ الاعراف: آیت ۱۷۲) میں تمام انسانوں کو آدم کی اولاد بتلاتے ہوئے سوالیہ رنگ میں انہیں اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ میں ہی تم سب کا رب ہوں، اس لئے سب کو میری مخلوق ہونے کو مدنظر رکھتے ہوئے آپس میں ایک دوسرے سے برادرانہ مشفقانہ سلوک کرو، اس مضمون کی آیات تو بہت ہیں سردست انہی چند آیات کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اسی لئے حضرت نبی کریم ﷺ نے اسلامی تعلیم کا خلاصہ ان دو لفظوں میں فرمایا العظمت لامراللہ والشفقۃ علی خلق اللہ، اور ساتھ ہی فرمایا لافضل لعربی علی العجمی ولالعجمی علی عربی الا بتقویٰ اللہ فضیلت ایک دوسرے پر اگر ہوسکتی ہے تو محض تقویٰ سے یعنی حقوق اللہ وحقوق العباد کے ادا کرنے سے ہوسکتی ہے۔

قوموں میں تنافر کی وجہ

قوموں میں تنافر کی وجہ صرف یہ ہے کہ حضرت نبی کریم ﷺ سے قبل جس قدر انبیاء علیہم السلام آئے وہ اپنی اپنی قوم کی طرف آئے ان کی اپنی قوم کے علاوہ ان کو کسی دوسری قوم سے کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا اس لئے ہر قوم یہی سمجھتی تھی کہ ہم ہی خدا کے بندے ہیں۔ چنانچہ یہود اور نصاریٰ نے تو صاف لفظوں میں کہا کہ ہم ہی اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں اسی طرح ہندو قوم بھی صرف اپنے آپ کو ہی پوتر اور اور دوسروں کو ناپاک قرار دیتی رہی، شودروں کے ساتھ ان کا سلوک اس پر واضح دلیل ہے۔ امریکہ میں آج تک حبشی قوم کے ساتھ امریکیوں کا سلوک بھی اسی حقیقت پر روشنی ڈال رہا ہے۔ قرآن کریم کی سورہ البقرہ، آیت ۱۴۵) میں صاف لکھا ہے، ''وما بعضھم بتابع قبلۃ بعض'' یہ اسی بنا پر کہا گیا ہے کہ ہر قوم دوسری قوم کو اپنے سے ادنیٰ یقین کرتی تھی، اب صرف اسلام ہی ہے جس نے اس بات کا اعلان کیا ہے کہ وان من امۃ الاخلافیھا نذیر ولکل قوم ھاد. یعنی ہر قوم کی طرف رسول آتے رہے ہیں اور سب سچے تھے اور ہمیں حکم ہے کہ ان سب رسولوں پر ایمان لائیں اور اگر دوسری قومیں بھی ہمارے اس طریق کو اختیار کریں گی تو تمام قوموں میں اتحاد قائم ہوجائے گا ورنہ شقاق قائم رہے گا۔ اسی طرح قرآن کریم نے اسی کلمہ مشترکہ پر قوموں کو متحد ہوکر امن اور چین کی زندگی بسر کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔

☆☆☆☆

اخوت ومحبت معاشرے کا اہم ستون ہے

رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ مومن کی نشانیوں میں سے ایک نشانی خندہ رو ہونا ہے، اور کھلی پیشانی سے ملنا ہے۔ یہ آپس میں باہمی الفت ومحبت بڑھانے کا ذریعہ بنتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا تیرے بھائی کے لئے مسکراتا ہوا چہرہ صدقہ ہے۔

قرآن پاک اوراحادیث رسول مقبول ﷺ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے اور حفظ مراتب کا خیال رکھنے سے بھی محبت بڑھتی ہے۔ مصافحہ کرنے اور گلے ملنے سے بھی محبت زیادہ ہوتی ہے۔ قرآن پاک کا حکم ہے سلام کا جواب بہترین انداز میں دیا جائے اس حکم کی تعمیل اس طرح ہوسکتی ہے کہ زیادہ گرم جوشی اور خندہ پیشانی سے جواب دیا جائے۔ اگر چہرے پر لاپرواہی، فکروغم کا اظہار ہوگا تو محبت بڑھانے کے بجائے ناراضگی کا سبب بنے گا۔ تحائف کا تبادلہ بھی محبت کا سبب بنتا ہے۔ ایک دوسرے کا استقبال کرنا بڑھ کر خوش آمدید کہنا، پھولوں کا تحفہ پیش کرنا بھی باہمی الفت ومحبت پیدا کرتا ہے۔ جو شخص ہر ملنے والے سے حسن سلوک کرے تو مرجع خلق بن جاتا ہے۔ سخت لہجہ، سردمہری تعلقات میں تلخی پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے۔ الفت ومحبت اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، اور مومنین کا وصف ہے۔ قرآن پاک کی سورہ التوبہ میں ارشاد ہوا ہے۔ ''مومنین مرد اور عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے معاون اور مددگار ہیں''۔ رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے مومنین سراپا الفت ومحبت ہیں اور اس آدمی میں سرے سے کوئی خیروخوبی نہیں، جو نہ دوسروں سے محبت کرے اور نہ دوسرے ہی اس سے محبت کریں۔ (مشکوٰۃ شریف)

قرآن کریم نے اخوت ومحبت کے رشتے کو استوار رکھنے پر بڑا زور ہے۔ باہمی حسن سلوک پر دنیا وآخرت کے انعامات اور اچھے درجے کی بشارت ہے۔ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ایسے لوگوں کی صحبت میں بیٹھو جنہیں دیکھ کر خدا یاد آجائے۔ جن سے گفتگو کر کے علم میں اضافہ ہو اور جن کا عمل آخرت سے دلچسپی پیدا کرنے کا موجب ہو۔ حضرت عمرؓ کا ارشاد ہے سچے اور مخلص دوستوں کی صحبت اختیار کرو، اور انہیں کے دائرے میں رہو۔ کیونکہ خوشحالی میں وہ باعث زینت ہیں اور آزمائش میں باعث نعمت ہیں۔ حسن سلوک اور اخوت کی فضیلت کا اندازہ قرآن کریم اور احادیث سے بخوبی ہوجاتا ہے۔ اخلاق حسنہ میں جو اعمال شمار کئے جاتے ہیں۔ ان میں عفو ودرگذر، راست گفتاری، عدل وانصاف، صلہ رحمی، خوش کلامی، بردباری، سادگی غرباء کی مدد شامل ہے۔ رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ کسی چھوٹی نیکی کو بھی حقیر نہیں سمجھنا چاہئے۔ مثلاً خندہ پیشانی سے ملنا، سلام کرنا، نرمی سے گفتگو کرنا یا کسی کے راستہ کی کوئی تکلیف دہ چیز ہٹا دینا۔ یہ سب باتیں حسن اخلاق میں شامل ہیں۔

اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ اس کے بندے خوش خلقی کے حسن سے مزین ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا سورہ القلم میں ارشاد ہے ترجمہ ''اور بلا شبہ آپ اخلاق کے اعلیٰ درجہ پر ہیں''۔ اسی طرح رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے ''جو چیز لوگوں کو جنت میں داخل کرے گی وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنا اور خوش خلقی ہے''۔

اخوت ومحبت کی بنیاد خوش خلقی ہے اس کے سوا دوستی اور محبت پیدا ہو ہی نہیں ہوسکتی۔

محبت کسی خاندان، برادری، جماعت بلکہ معاشرے کا اہم ستون ہے۔ سورہ الانفال کی آیت نمبر ۶۳ میں ارشاد فرمایا ''جو لوگ خالصتاً اللہ تعالیٰ کی خاطر آپس میں محبت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کو جوڑ دیتا ہے۔ (بحوالہ: پیغام صلح)

☆☆☆

طب وصحت

صحت عامہ

سید رشیدالدین احمد

کینسر سے بچنے کے دس گر

تحقیق اور تجربات سے یہ ثابت ہوگیا ہے کہ سرطان کی مختلف قسموں کا تعلق طرز حیات اور ماحول سے ہوتا ہے یعنی آپ کیا کھاتے پیتے ہیں اور کہاں کام کرتے اور آپ کے تفریحی معمولات کیا ہیں۔

تحقیق اور تجزیات نے یہ بھی ثابت کردیا ہے کہ ہر شخص اپنی زندگی اور اس کے انداز کا جائزہ لے کر اس میں تبدیلی کے ذریعے سے خود کو سرطان جیسے مہلک مرض سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔

اس سلسلے میں سب سے زیادہ تحقیقی کام امریکہ میں ہوا۔ چنانچہ امریکن کینسر سوسائٹی کے مطابق پانچ مثبت عملی اقدامات اور پانچ حفاظتی تدابیر کے ذریعے سے ہر شخص خود کو اس مرض سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔

پانچ مثبت عملی اقدامات

۱۔گوبھی کی قسم کی سبزیاں زیادہ کھائیے

متعدد مطالعوں سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ گوبھی کی قسم کی سبزیوں کے زیادہ استعمال سے پھیپھڑوں، پیٹ اور بڑی آنت اور مقعد کے سرطان سے تحفظ حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے بند گوبھی اور پھول گوبھی زیادہ کھائیے۔ سرسوں کا ساگ بھی مفید ہے۔

۲۔ریشے دار غذائیں زیادہ کھائیے

یہ جدید اصطلاح میں فائبر کہلاتی ہیں۔ ایسی تمام غذائیں جن میں ریشہ یعنی فائبر زیادہ ہوتا ہے قولون (بڑی آنت) کے سرطان سے محفوظ رکھتی ہیں۔ ریشہ، پھلوں، سبزیوں، بغیر پالش کے چاولوں، بے چھنے آٹے چھلکے والی دالوں، ثابت اناج دلیوں وغیرہ میں خوب ہوتا ہے۔

۳۔حیاتین الف والی غذائیں زیادہ کھائیے

حیاتین الف یعنی ''وٹامن اے'' غذائی نالی، گلے اور پھیپھڑے کے سرطان سے محفوظ رکھتی ہے۔ یہ حیاتین انڈے کی زردی، کلیجی، دودھ، دہی، بالائی، اصلی گھی اور پنیر میں ہوتی ہے۔ دودھ اور اس سے تیار ہونے والی اشیاء اعتدال کے ساتھ کھانی چاہئیں کیونکہ ان سے کولیسٹرول بڑھ سکتا ہے۔

لیکن اگر آپ گہرے زرد رنگ کی سبزیاں اور گہری ہری سبزیاں زیادہ کھائیں تو ان سے حیاتین کے علاوہ ریشہ بھی جسم کو خوب ملے گا۔ ان میں پپیتا، آم، آڑو، زرد چھلکے والے کیلے، لال کدو، گاجریں، پالک، میتھی، سرسوں بتھوا، چولائی، مولی، شلجم، چقندر کے پتے شامل ہیں۔ حیاتین الف کے کیپسول اور گولیوں کے مقابلے میں یہ پھل اور سبزیاں اس وٹامن کے بہتر ذرائع ثابت ہوتے ہیں۔ ویسے بھی اس حیاتین کی گولیاں زیادہ مقدار میں کھانا خطرناک ہوتا ہے۔

۴۔حیاتین ج والی غذائیں کھائیے

حیاتین ج یعنی وٹامن سی والی غذائیں آپ کو غذائی نالی اور پیٹ کے سرطان سے محفوظ رکھتی ہیں۔ یہ حیاتین تمام ترترش پھلوں، سنترے، مالٹے، فروٹر، کینو اور لیموں کے علاوہ پپیتے، امرود، آم، تربوز، انناس، سیب، انگور اور تمام تازہ ساگ (بھاجیوں) میں ہوتا ہے۔

چھاتی، رحم، پتے اور قولون کے سرطان سے موٹاپے کا بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے، اس لیے اپنا وزن اپنے قد کے لحاظ سے مقررہ حد میں رکھئے۔ اس کے لیے متوازن غذا کا استعمال اور باقاعدہ ورزش بہت ضروری ہے۔

احتیاطی تدابیر

۵۔اپنی غذا میں چکنائی کم کردیجئے

زیادہ روغنی غذاؤں کے استعمال سے چھاتی کے سرطان کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ چکنی غذاؤں سے قولون اور مثانے کے غدود (پروسٹیٹ) کا سرطان بھی ہوتا ہے۔ صحت مند غذا وہ ہے جس کے کل حراروں میں سے صرف ۲۰ سے ۲۶ فیصد حرارے روغنی اجزاء سے حاصل ہوں۔ گوشت عضلاتی کھائیے یعنی بونگ، مچھلی اور کھال اتری ہوئی مرغی کا گوشت زیادہ استعمال کیجئے۔ دودھ، دہی، بغیر بالائی کا استعمال کیجئے، کھانوں کی تیاری میں گھی، تیل، چربی کم سے کم استعمال کیجئے۔

۶۔نمک کم کھائیے

جن ملکوں میں نمک لگا خشک گوشت، خشک نمک لگی مچھلی زیادہ کھائی جاتی ہے، وہاں غذائی نالی اور پیٹ کا سرطان زیادہ عام ہوتا ہے۔ اس لیے نمک لگی خشک مچھلی، گوشت، ڈبا بند سالن، اچار، پاپڑ وغیرہ کم کھائیے۔

۷۔تمباکو ترک کیجئے

تمباکو ہر حال میں صحت کی دشمن ہوتی ہے ۔تمباکو پینے والے پھیپھڑوں کے سرطان میں مبتلا ہوتے ہیں اور تمباکو کھانے سے منہ اور حلق کے سرطان کے خطرات بہت بڑھ جاتے ہیں۔

۸۔شراب سے دور رهیے

شراب سے جگر کا سرطان ہوجاتا ہے۔ اس کے ساتھ تمباکو کا استعمال جگر کے علاوہ منہ ،حلق، اورغذائی نالی کے سرطان کا سبب بنتا ہے۔اسے تفریح کا سامان نہ سمجھئے۔

۹۔ زیادہ دھوپ سے بچئے

دھوپ کی کثرت سے سفید فام جلد کے سرطان میں مبتلا ہوتے ہیں لیکن جب سے اوزون کی تہہ میں سوراخ بن گئے ہیں،سورج کی الٹراوائلٹ شعاعوں کی کثرت سے سب کے لیے خطرات بڑھتے جارہے ہیں۔اس لیے صبح ۱۱سے ۳ بجے سہ پہر تک دھوپ میں کم سے کم نکلنا چاہئے۔اس سے بچنے کے لیے چھتری،لمبی آستینوں کا لباس،ٹوپی وغیرہ استعمال کرنی چاہئے۔

یاد رہے کہ......

سرطان کا سب سے بڑا خطرہ تمباکو سے لاحق رہتا ہے۔اس کے ساتھ دیگر اسباب شامل ہوجائیں تو یہ خطرہ اور بھی بڑھ جاتا ہے۔

۱۰۔ اب کیا کرسکتے ھیں؟

شعور صحت سے کام لیجئے اور اپنی زندگی کے رنگ ڈھنگ بدل ڈالیے۔کھانے پینے کے انداز تبدیل کیجئے۔اس طرح آپ خود اور آپ کے خاندان کے تمام افراد سرطان سے محفوظ رہیں گے بلکہ دیگر کئی امراض سے بھی آپ کو تحفظ حاصل رہے گا۔ ☆☆☆

دانتوں کی بیماری شهری علاقوں میں زیادہ

ملک میں دانتوں کے ڈاکٹروں کی کمی وجہ سے دانتوں سے متعلق بیماریوں کا بیشتر لوگ علاج نہیں کراپاتے۔صحت کے عالمی ادارے کی سفارش کے مطابق ساڑھے سات ہزار افراد پر دانتوں کے ایک ڈاکٹر کا اوسط مثالی ہے۔جبکہ ہمارے ملک میں ۱۳۶۵۳۷ افراد پر دانتوں کا ایک ڈاکٹر ہے۔یہی وجہ ہے کہ ۶۰ فیصد سے زائد بچوں اور ۸۰ فیصد سے زائد افراد میں دانتوں کی سڑن،ڈینٹل کیرج، کی بیماری پائی جاتی ہے۔ایک سروے کی حال ہی میں جاری رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ملک میں ۱۵برس کی عمر کے ۶۳٫۹ فیصد بچوں اور ۳۵سے ۴۴برس کے ۷۰٫۲ فیصد لوگوں میں دانتوں کی بیماری ہے۔

رپورٹ کے مطابق ۱۵برس کے ۶۷٫۷ فیصد بچوں اور ۳۵ سے ۴۴ برس کے ۷۶٫۶ فیصد افراد میں مسوڑھوں کی بیماریاں ہیں۔رپورٹ کے مطابق لوگوں کی اقتصادی ،سماجی صورتحال کا براہ راست تعلق ان کی ذاتی صفائی سے ہوتا ہے اس کے علاوہ صحت پر کئی دیگر اسباب کی وجہ سے بھی اثر پڑتا ہے۔ملک کے بیشتر حصوں میں لوگ کھینی، گٹکھے ، پان مسالہ اور زردہ کی صورت میں تمباکو کا استعمال کرتے ہیں۔اس کا براہ راست اثر دانتوں اور منہ کی اندرونی جھلی پر پڑتا ہے، جو کئی بار منہ،زبان اور گلے کے کینسر کی بڑی وجہ ہیں۔ رپورٹ کے مطابق جو لوگ پان مسالے، گٹکھے اور زردہ کے شوقین ہیں ان کے دانتوں پر گہرے لال رنگ کی پرت پائی گئی ہے، جو برش کرنے سے بھی صاف نہیں ہوتا۔ دانتوں کے ڈاکٹروں کے مطابق پوری دنیا میں لوگوں کو دانتوں کی سڑن کی بیماری کا سامنا ہے۔جس کا آغاز داڑھوں کے بالائی حصے پر کالے کالے دھبے سے ہوتا ہے جنہیں ہم اکثر نظر انداز کرتے ہیں۔لیکن بعد میں یہ بڑی بیماری کے روپ میں ابھرتے ہیں۔

دانتوں کی سڑن کی بنیادی وجہ منہ کے اندر پائے جانے والے بیکٹریا ہیں۔اگر ابتداء میں ہی دانتوں کی صفائی پر توجہ دی جائے مثلاً میٹھی چیزیں کھانے کے بعد کلی کرنا، رات کو سونے سے پہلے برش کرنا اور کسی اچھے ماؤتھ واش کو پانی میں ملا کر غرارے کرنا جیسی عادتیں اختیار کی جائیں تو بیکٹریا دانتوں کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔لیکن ایک بار اگر دانتوں میں کیویٹیز بن جائے تو اس سے نجات نہیں مل سکتی، کیونکہ دانتوں کا خراب شدہ حصہ واپس نہیں آسکتا۔ ایسی حالت میں دانتوں کے کسی ڈاکٹر سے مشورہ کر کے دانتوں میں سونا چاندی یا کسی دیگر چیز سے بھروا کر نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔اگر دانتوں میں کیویٹیز ہونے پر انہیں نظر انداز کردیا جائے تو یہ بیکٹریا دانتوں کے اندر کی پرت کو ختم کردیتے ہیں۔ایسی حالت میں دانتوں کے اندر پائی جانے والے خلیوں پر ٹھنڈے اور گرم پانی یا کوئی دیگر چیز کھانے سے اثر پڑتا ہے، اور اس سے شدید درد ہوتا ہے۔اس سروے میں ۱۸ ریاستوں میں سے ۱۵ میں ۸۰ سے ۹۹ فیصد لوگ دانتوں کی سڑن میں مبتلا پائے گئے۔ چنڈی گڑھ میں سب سے زیادہ ۹۹٫۷ فیصد اور کیرالہ میں ۷۱٫۴ فیصد لوگوں میں یہ بیماری پائی گئی۔